

(سلسلہ انجمن ترقی اردو نمبر ۲۹)

۲۳

# دیوان لفظین

مرتبہ

جناب زرافرحق اللہ بیگ صاحب بی۔ اے

اسٹنٹ ہوم سکریٹری ریاست حیدرآباد (دکن)

ہفتا محمد تقی خان اشرفانی

مطبع مسلم پریس علی گڑھ میں طبع ہوا  
۱۹۳۰ء ۳۰ ط ۴۱۳۲۹

ایک ہزار

طبع اول

1 878 =

**Collection of Prof. Muhammad Iqbal Mujaddidi  
Preserved in Punjab University Library.**

پروفیسر محمد اقبال مجددی کا مجموعہ  
پنجاب یونیورسٹی لائبریری میں محفوظ شدہ



;

;



129057



بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

## دیباچہ

ہر یہ کہ جو بات ہونے والی ہوتی ہے وہ ہو کر رہتی ہے۔ بھلا مچھکو دیکھو اور انعام اللہ  
خاں یقین کے دیوان کی تصحیح اور طبع کرانے کو دیکھو۔ اس کے لئے کتب خانے کی  
وسعت نظر کی عیبت کی شاعری کی اور سب سے زیادہ فرصت کی ضرورت ہے۔ میرے  
پاس ان میں سے کوئی چیز نہیں۔ کچھ تھوڑی بہت کتابیں تھیں ان کو دیکھنے کھا کر  
برابر کر دیا۔ شاعری سرکاری نوکری کے نذر ہو گئی۔ اب رہی فرصت تو اس کا  
پوچھنا ہی کیا ہے۔ ملازمت اور فرصت دو متضاد لفظ ہیں۔

اب دیکھئے کہ یہ سلسلہ چھڑا کیوں کر۔ میں دیوان تابان نواب سالار جنگ بہادر  
کے ہاں سے لا کر نقل کر رہا تھا اسی جلد میں دیوان یقین بھی تھا۔ کبھی کبھی اس پر بھی  
نظر پڑ جاتی تھی۔ خدا معلوم یہ شعر کیوں کر یاد رہ گیا۔

اپنے بندوں کو جلا کر خاک کرتے ہیں نصین  
ان بتوں کی ضد سے ہو جاؤں مسلمان تو سہی

ایک دن یونہی بیٹھے بیٹھے یہ شعر میں نے غلام زیدانی صاحب کے سامنے پڑھا۔  
ان کو بہت پسند آیا۔ کہنے لگے۔ "مرزا صاحب! یہ شاعر تو اچھا معلوم ہوتا ہی۔ کلام میں  
بڑی شیرینی ہے۔ اس پر کچھ لکھ ڈالو۔" خبر نہیں کہ ان کا یہ کہنا اتنا کیوں اثر کر گیا کہ  
رات بھر اسی دھن میں لگا رہا کہ کب صبح ہو اور کب دیوان یقین جا کر لاؤں۔ صبح  
ہوتے ہی نواب سالار جنگ بہادر کے پاس عرض کرالی کہ چند روز کے لئے دیوان یقین  
دے دیجئے۔ نواب صاحب کو خدا اچھا رکھے کچھ عجب علم دوست شخص واقع ہوئے ہیں،  
ایک چھوڑ دو، دو دیوان بھیج دیئے۔ ان کا کچھ حصہ پڑھا۔ اس سے شوق اور بڑھا۔  
مولوی عبدالحق صاحب کو خط لکھا۔ خدا جانے جوش میں کیا کیا لکھ گیا۔ انہوں نے  
دیوان یقین کے تین قلمی نسخے بھیجے۔ مگر ساتھ ہی میرے خط کے الفاظ کی شکایت کی۔  
میں نے معذرت کے ساتھ شکریہ ادا کیا۔ تین نسخے کتب خانہ آصفیہ میں ملے۔ دو نسخے  
آغا حیدر حسن صاحب پروفیسر نظام کالج سے لئے۔ تین نسخے مولوی عمر یافعی صاحب نے  
لا کر دیئے۔ غرض دو اور تین پانچ اور تین آٹھ اور دو دس اور تین تیرہ نسخے مل گئے۔  
ان میں ایک نسخہ مطبوعہ تھا، بنگلور میں چھپا تھا۔ اس میں اول تو غزلیں کم ہیں، دوسرے  
غلطیاں بہت ہیں۔ پھر حال دیوان کی ترتیب و تصحیح کے لئے کافی مواد ہو گیا۔ اس کے  
بعد یقین کے حالات معلوم کرنے کا فکر ہوا۔ کچھ تذکرے خریدے، کچھ مانگے کے لئے،

کچھ کتب خانہ میں دیکھے، کچھ نقل کر کے منگوائے۔ قصہ مختصر ان تذکروں کا ایک اہتمام ہو گیا۔ تاریخ ادب ہندوستان مولفہ گارساں دی تاسی فرانسسی میں ہے۔ اس کے بعض حصوں کا ترجمہ ہارون خاں صاحب شروانی پروفیسر عثمانیہ یونیورسٹی نے اور بعض کا ترجمہ عبداللطیف صاحب خطیب پرنسپل جاگیر دار کالج نے کر کے دیا۔ مصحفی کے تذکرے کی نقل عابد حسین صاحب اس پرنسپل جامعہ ملیہ دہلی نے بھی۔ اس طرح کتابوں کے بارے کے ساتھ احسانات کا بار بھی بڑھتے بڑھتے ناقابل برداشت ہو گیا۔ اب جو کچھ لکھ رہا ہوں وہ پسند کیا گیا تو فہما، نہیں تو میری محنت گئی اور ان لوگوں کا احسان رہ گیا۔ اس کتاب کی ترتیب میں جن کتابوں سے مدد لی گئی ہے ان کی فہرست ذیل میں دیتا ہوں۔ ان کے علاوہ بھی مجھے سیکڑوں کتابوں کی ورق گردانی صرف اس امید پر کرنی پڑی ہے کہ شاید یقین یا ان کے خاندان کا کچھ حال مل جائے۔ بہر حال میں اتنی محنت اٹھانے کے لئے ہرگز تیار نہ تھا، مگر سنگ آمد و سخت آمد کی صورت تھی۔ یہ بھی جی نہ چاہا کہ اتنا کچھ کر کے چھوڑ دوں۔ ہاں تو فہرست ملاحظہ ہو:

نمبر شمارہ	نام کتاب	نام مولف	تاریخ تالیف
۱	نکات اشعرا	میر تقی میر	۱۱۶۴ھ
۲	تذکرہ شعراء ہند	فتح علی حسین گردیزی	۱۱۶۵ھ
۳	تذکرہ ہزم گلشن گفزار	خواجہ حمید الدین اورنگ آبادی	۱۱۶۵ھ

۱۵ مطبوعہ انجمن ترقی اردو، اورنگ آباد دکن ۱۲ ۱۵ ان کا شمار دہلی کے مشہور صوفیوں میں ہوتا تھا۔  
(بقیہ بر صفحہ آئندہ)

نمبر شمار	نام کتاب	نام مؤلف	تاریخ تالیف
۴	مخزن نکات	قیام الدین - قائم	۱۱۷۸ھ
۵	چمنستان شعراء	پچھمن نرائین - شفیق	۱۱۷۵ھ
۶	طبقات الشعراء	قدرت اللہ شوق	۱۱۸۸ھ
۷	تذکرہ شعرائے اردو	میر غلام حسن - حسن	۱۱۸۸ھ و ۱۱۹۲ھ
۸	گلزارِ ابراہیم	علی ابراہیم خاں	۱۱۹۶ھ و ۱۱۹۸ھ
۹	تذکرہ ہندی	غلام بہدانی - مصحفی	۱۲۰۹ھ
۱۰	تاریخ ادب ہندوستان	گارساں دی تاسی	۱۲۱۱ھ
۱۱	گلشن ہند	مرزا علی لطف	۱۲۱۵ھ
۱۲	گلشنِ بنجار	نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ	۱۲۵۰ھ
۱۳	طبقات الشعراء	کریم الدین	۱۲۶۲ھ
۱۴	تذکرہ سراپاسخن	سید محسن علی محسن	۱۲۶۹ھ

(بقیہ نوٹ) ۱۲۲۱ھ کے کچھ بعد دہلی میں فوت ہوئے۔ میر تقی میر نے انعام اللہ خاں یقین کے خلاف بہت زہرا لگایا اس کو دیکھ کر گردیزی کو جوش آگیا اور تذکرہ شعرائے ہند لکھ کر دل کا بخار نکالا۔ انجمن ترقی اردو (اورنگ آباد) نے یہ تذکرہ طبع کرایا ۱۲

۱۵ قدرت اللہ شوق موضع موسیٰ ضلع سہیل کے رہنے والے تھے۔ اپنے زمانہ کے عالموں میں ان کا شمار عرصہ تک دہلی میں رہے۔ پھر رام پور میں جا بسے۔ قیام الدین قائم کے شاگرد ہوئے۔ ان کا انتقال ۱۲۰۷ھ و ۱۲۱۰ھ کے درمیان ہوا ہے۔ ان کا تذکرہ بہت کم ملتا ہے۔ کتب خانہ آصفیہ حیدرآباد دکن میں اس کا ایک نہایت خوش خط نسخہ ہے ۱۲۱۵ھ مطبوعہ انجمن ترقی اردو (اورنگ آباد) دکن



نمبر شمارہ	نام کتاب	نام مولف	تاریخ تالیف
۱۵	سخن شعراء	عبد الغفور نسلی	۱۲۸۱ھ
۱۶	گلستانِ بجزاں	قطب الدین باطن	۱۲۹۱ھ
۱۷	آب حیات	محمد حسین آزاد	۱۸۸۲ء
۱۸	بزم سخن	سید علی حسن خاں	۱۲۹۷ھ
۱۹	آبِ بقا	مرزا جعفر علی نشتر	۱۹۱۸ء
۲۰	گلِ رعنا	حکیم عبدالحی	۱۳۲۰ھ
۲۱	اورینٹل بائیو گریفیکل ڈکشنری	ولیم ہیل	۱۸۷۵ء
۲۲	خزینۃ الاصفیاء	علامہ سرور	۱۲۸۱ھ

۱۵۔ مرزا ابو محمد عبد الغفور خالدي نسخ کلکتہ کے رہنے والے اور ضلع راجشاہی معروف برہمپور بولہ میں ڈپٹی کلکٹر تھے شاعر اور صاحبِ ذوق تھے۔ اساتذہ کے کلام دیکھنے کا بھی بہت شوق تھا ۱۲ برس کی محنت میں تذکرہ سخن شعراء تالیف کیا۔ میں نے دوسرے تذکروں سے اس کا مقابلہ کیا۔ ان کی اپنی تحقیقات کچھ یہ ہیں صرف قدیم تذکروں سے واقعات نقل کئے ہیں۔ ۱۷۔ قطب الدین باطن۔ ان کے والد عرب سرانے کے رہنے والے تھے جو دہلی سے تین میل ہے۔ بعد میں آگرہ جا رہے۔ باطن وہیں پیدا ہوئے۔ یہ خاندان حکیموں کا ہے۔ باطن کو نظیر اکبر آبادی سے تلمذ تھا شیخ نے گلشنِ بیجار میں نظیر کی تعریف نہیں کی۔ اس کے جواب میں انہوں نے یہ تذکرہ آرد میں لکھا ہے اور شیخ کے استاد حکیم مومن خاں مومن کے متعلق بہت واہمی بنا ہی بکا ہے۔ تذکرہ کی عبارت ایسی ہے کہ اس کا سمجھنا مشکل ہے۔ ۱۸۔ حکیم عبدالحی مدوۃ العیال لکھنؤ کے ناظم تھے۔ جنت المشرق یعنی جغرافیہ ہند کتاب المعارف۔ بہت احواط وغیرہ ان کی مشہور تالیفات ہیں۔ ۱۹۔ ۲۰۔ ۲۱۔ ۲۲۔ ۱۳۲۱ء میں انتقال کیا ۱۲۔ علامہ سرور لاہور کے رہنے والے اور لاہور کے مفسیوں کے (بقیہ نوٹ بر صفحہ آئندہ)

نمبر شمار	نام کتاب	نام مولف	تاریخ تالیف
۲۳	ماثر الامراء	صمصام الدولہ شاہ نواز خاں	۱۹۲۲ء
۲۴	مجموعۃ الانتخاب	فقیر شاہ کمال الدین حسین کمال	۱۲۱۹ھ
۲۵	فہرست کتب خانہ شاہ اودھ	ڈاکٹر اسپرنگر	۱۸۲۸ء

(بقیہ نوٹ صفحہ گزشتہ) خاندان سے تھے۔ خزینۃ الاصفیاء دو جلدوں میں لکھی ہے اور اس میں صوبہ کراچی کے تمام سلسلوں کے حالات نہایت شرح و بسط سے درج کئے ہیں۔ شاہ نواز خاں نام صمصام الدولہ خطاب خاندان آصفی کے امراء میں تھے۔ ۱۱۶۴ھ میں نواب امیر الممالک خلف آصف جاہ خطاب ترازہ کی خدمت و کالت سے سرفراز ہوئے۔ عالم بھی تھے اور علم دوست بھی۔ علامہ غلام علی آزاد بلگرامی سے خاص تعلق رکھتے تھے۔ ماثر الامراء کی تالیف میں علامہ مذکور سے بھی مدد لی ہے۔ یہ تالیف بلحاظ تفصیل و تحقیق ایک لاجواب کتاب ہے۔ شاہ کمال الدین کمال اردو کے مشہور شاعر تھے۔ ان کے بزرگ کڑھ مانگ پور کے رہنے والے تھے۔ لیکن ان کے والد بہار میں جا بسے۔ شاہان مغلیہ کے زمانہ میں ان کے بزرگ بڑی بڑی خدمات پر مقرر تھے۔ جوانی ہی میں کمال فقیر ہو گئے اور ننگال ہوتے ہوئے لکھنؤ پہنچے۔ پہلے یہ کسی کے شاگرد نہیں ہوئے اور اپنی اصلاح کے لئے اساتذہ کے کلام کا ایک بڑا ذخیرہ جمع کر لیا۔ بعد میں جرات سے اصلاح یعنی شروع کی۔ آخر میں پھرتے پھرتے اپنے جمع کردہ دیوان کے ساتھ حیدرآباد دکن آئے اور یہیں ان کا انتقال ہوا۔ دکن میں شمالی ہند کے شعراء کے دیوانوں کا جو ذخیرہ ہے وہ اکثر و بیشتر کمال ہی کے لئے ہوئے دیوانوں کی نقل ہے۔

ان کا مجموعۃ الانتخاب ایک ضخیم کتاب ہے۔ لیکن شعراء کے حالات صرف ایک ایک دو دو سطروں میں دیئے ہیں۔ ۱۸۲۳ء تک کمال زندہ تھا۔ اس وقت اس کی عمر ۷۰ سال کی تھی۔ نواب کرنول نے اس کو جاگیر دی تھی۔ کرنول کی ریاست ضبط ہوئی۔ لیکن کمپنی نے کمال کی جاگیر بھر اس پر بحال کر دی۔ ۱۲۳۵ھ ڈاکٹر اسپرنگر وہ مستشرق ہیں جن کی ذات پر یورپ کو بھی ناز ہے۔ انہوں نے گورنمنٹ آف انڈیا کے حکم سے جو فہرست کتب خانہ شاہ اودھ کی مرتب کی ہے وہ دیکھنے کے قابل ہے۔ حالات کو مختصر ہے لیکن (بقیہ بر صفحہ آئندہ)

نمبر شمار	نام کتاب	نام مولف	تاریخ تالیف
۲۶	فہرست کتب خانہ برٹش میوزیم	چارلس ریو	۱۸۷۹ء
۲۷	فہرست کتب خانہ انڈیا آفس (فارسی)	ہرمن ایٹھے	۱۹۰۳ء
۲۸	فہرست کتب ایشیاٹک سوسائٹی بنگال	آیونو	۱۹۲۲ء
۲۹	فہرست کتب انڈیا آفس (اردو)	بلوم ہارٹ	۱۹۲۶ء
۳۰	مخخانہ جاوید جلد اول تا چہارم	لالہ سری رام دہلوی	۱۳۲۵ھ

بقیہ نوٹ صفحہ گزشتہ) تحقیقات کے لحاظ سے بہترین کتاب ہے۔ کیا اچھا ہو اگر انجمن ترقی اردو اس کتاب کے اس حصہ کو جو شعراے اردو سے متعلق ہے ترجمہ کر کے شائع کرے! انعام اللہ خاں نقین کے کلام کے متعلق جہاں میں نے تذکرہ نویسوں کی رائے لکھی ہے وہاں ڈاکٹر اسپرنگر ہی کا طریقہ بیان اختیار کیا، یعنی پہلے تذکرہ نویس کی رائے اور اس کے بعد قوس میں اس کا نام۔ اس سے یہ فائدہ ہوتا ہے کہ تذکرہ نویس کا نام دیکھتے ہی معلوم ہو جاتا ہے کہ اس کی رائے پر اعتماد کیا جاسکتا ہے یا نہیں۔

۱۷ لالہ سری رام ایم اے۔ دہلی کے رئیس اور اردو کے دلدادہ ہیں۔ آپ کے والد لالہ مدن موہن آجہانی بہت مشہور وکیل گزرے ہیں۔ سری رام صاحب عرصہ تک خدمت منصفی پر رہے لیکن اس زمانہ میں بھی اردو کے ذوق و شوق کو ہاتھ سے نہ دیا اور مدتوں کی تلاش اور لاکھوں روپے خرچ سے شعراے اردو کے دیوانوں کا ایسا ذخیرہ جمع کر لیا کہ اس کا مقابلہ شاید ہی کہیں کا کوئی کتب خانہ کر سکے۔ جب ملازمت سے فارغ ہوئے تو تالیف کا رخ کیا اور مخخانہ جاوید کو نہایت آب و تاب اور تحقیق و تلاش سے مرتب کر کے شائع کرایا۔ اس کی چار جلدیں طبع ہو چکی ہیں۔ دس بارہ اور باقی ہیں! فسوس کہ حال ہی میں ان کا انتقال ہو گیا۔

سب سے پہلے میں نے یہ کیا کہ جو نسخہ مجھے نواب سالار جنگ بہادر کے کتب خانہ ملا تھا اس کی نقل کی۔ یہ ہی نسخہ سب سے پرانا تھا اور ۱۹۷۷ء میں لکھا گیا تھا۔

اس کے بعد دوسرے نسخوں سے اس کا مقابلہ کیا۔ الفاظ کی بھی درستی کی اور جو نئی غزل ملی وہ بڑھالی۔ غرض تیرہ قلمی دیوانوں سے اس کی صحت کر کے تذکروں کے اشعار سے مقابلہ کیا اور اس طرح ایک ایسا نسخہ مرتب کر لیا جو کیا بلحاظ صحت الفاظ (بشرطیکہ مطبع والے اس کو قائم رکھیں) اور کیا بلحاظ تعداد اشعار مکمل نہیں تو مکمل کے قریب قریب ضرور ہے۔ اس مقابلہ میں جو مشکلیں مجھ پر پڑی ہیں وہ میرا دل ہی خوب جانتا ہے۔ نمونہ کے طور پر ایک شعر دیتا ہوں تاکہ معلوم ہو سکے کہ قلمی کتابوں میں کیسی غلطیاں ہوتی ہیں اور کس طرح بے سوچے سمجھے نقل کی جاتی ہے۔ یہ شعر میں اس لئے بھی دے رہا ہوں کہ اب تک مجھے اس کے متعلق اطمینان نہیں ہوا:

اگر رستم ہو عاشق، دم نہ مارے یار کے آگے

کہ اس کا جی نکل جاوے گا اس کی ایک ننگن میں

دامن، گلشن قافیہ ہے اب ملاحظہ ہو کہ اس شعر کا قافیہ قلمی نسخوں میں اس طرح ہے:

(۱) لنگن (۲) سنگن (۳) لنگن (۴) تھنگن (۵) ٹھن کن

(۶) ٹھونگن (۷) پھین

مجھے تو لنگن کا قافیہ سب سے بہتر معلوم ہوا کیوں کہ پہلے زمانہ میں پہلوانوں کی

۱۵ عمر یافعی صاحب کا ایک نسخہ بعد میں ملا جو اس سے بھی پرانا اور ۱۸۷۷ء کا لکھا ہوا تھا ۱۱

اصطلاح میں لنگن بمقابل کے جانگیہ میں ہاتھ ڈال کر پٹ دینے کو کہتے تھے اب اس  
 بیچ کو قلابگ کہتے ہیں۔ پھین بھی آسکتا ہے۔ کیوں کہ تلوار پھینے کو پھین کہتے ہیں  
 بقیہ الفاظ کے اگر کچھ معنی ہوں تو ہوں۔ میں نے بہت سی لغت کی کتابیں دیکھی ہیں  
 مجھے تو کہیں نہیں ملے۔

بس ایک ہی شعری جس کے ایک لفظ کے متعلق مجھے شبہ ہی باقی تمام دیوان  
 میں کہیں شبہ کی گنجائش نہیں ہے۔ ہاں البتہ جہاں کسی قلمی نسخہ میں کوئی ایسے الفاظ ملے  
 جو وہاں چسپاں بھی ہوتے تھے اور معنی کو بھی وسعت دیتے تھے ان کو "ن" دیکر  
 حاشیہ میں لکھ دیا ہے۔

اس کے بعد سب سے مشکل سوال الفاظ کی املا کا تھا۔ پرانے زمانہ کی عینی کتابیں  
 چھپتی ہیں ان میں تو کو توں، جھکو کو جھکوں وغیرہ لکھا جاتا ہے۔ تاکہ جوں کی  
 توں نقل ہو جائے اور دیکھنے والا دیکھتے ہی سمجھ لے کہ اوہو بڑے پرانے  
 زمانہ کی کتاب ہے۔ میں نے اس پرانے طریقہ کو ترک کر دیا ہے اور موجودہ زمانہ  
 کی املا میں الفاظ کو لکھا ہے تاکہ پڑھنے میں آسانی ہو، اور تحریر بدحیثیت نہ ہو جائے  
 ہاں یہ ضرور ہے کہ قدیم زمانہ میں جو الفاظ راج تھے ان کو مجنبہ قائم رکھا ہے۔ غرض  
 سوائے تھوڑی سی املا کے رد و بدل کے میں نے خود اس دیوان میں اپنی طرف سے  
 ایک لفظ کم یا زیادہ نہیں کیا ہے۔

# نواب انعام اللہ خاں یقین

خاندانی حالات | انعام اللہ خاں نام، یقین تخلص دہلی میں پیدا ہوئے اور ایسے خاندان میں پیدا ہوئے جو اگر ایک طرف اپنے زہد و تقویٰ، بزرگی و نجابت میں مشہور و معروف تھا تو دوسری طرف دولت و ثروت، امارت و وقار میں نامور اور ممتاز تھا۔ اگر ان کے دادا حضرت شیخ عبدالاحد نقشبندی مجددیؒ اپنے کمالاتِ باطنی کی وجہ سے مرجعِ خلائق تھے، تو ان کے نانا نواب حمید الدین خاں اپنی شجاعت و بہادری کے باعث سلطنت کے رکنِ رکین مانے جاتے تھے۔ ان کا سلسلہ نسب اگر دوھیال کی طرف سے چوتھی پشت میں حضرت شیخ احمد مجدد الف ثانی اور تیسویں واسطہ سے خلیفہ دوم حضرت عمر رضی اللہ عنہ پہنچتا تھا تو تھنیال کی جانب سے چوتھی پشت میں باقی خاں قلماق چلیہ شاہجہانی سے جا ملتا تھا۔

حضرت شیخ احمدؒ سے شاہانِ مغلیہ کو خاص ارادت تھی اور جہانگیر کے عہد سے لگا کر اورنگ زیب کے آخری زمانہ تک خود بادشاہ، شاہزادے، امراء و علماء دربار سب کے سب اسی سلسلہ میں بیعت ہوتے تھے۔

حضرت شیخ احمد سرسندیؒ کے بعد آپ کے دو فرزند شیخ احمد سعیدؒ اول

شیخ محمد معصوم و سادہ ہدایت و ارشاد پر بیٹھے۔ شیخ احمد سعید کے بعد ان کے فرزند شیخ عبدالاحد المعروف بہ شاہ وحدت المتخلص بہ گل سجادہ نشین ہوئے۔ یہ انعام اللہ خاں یقین کے دادا ہیں۔ آپ کی شہرت کا یہ حال تھا کہ میر تقی میر جیسا بد دماغ شخص ان کی خدمت میں حاضر ہوا۔ چنانچہ اپنی کتاب نکات الشعرا میں لضمین حالات انعام اللہ خاں یقین لکھتے ہیں کہ:

”باغدش در سر نہ ملاقات کردہ بودم۔ بسیار آدم بافرہ یافتہ  
 بلوک پیش آمدہ، و ضیافت فقیر کردہ۔ تا دیر نشستہ صحبت مستوفی داشتم  
 شعر بطرز من گوید“ ۸۱

شیخ عبدالاحد کے فرزند شیخ اطہر الدین سر نہ چھوڑ دہلی آئے۔ یہاں آپ کے خاندانی فضائل کا ہر شخص معتقد تھا۔ سب ہاتھوں ہاتھ لیا اور نواب حمید الدین خاں نے اپنی صاحبزادی کی شادی آپ سے کر دی اور اس طرح دونوں خاندانوں میں معیت کے سلسلہ کے علاوہ دنیاوی سلسلہ بھی قائم ہو گیا۔

نواب حمید الدین خاں کے والد کا نام سردار خاں اور دادا کا نام باقی خان چلبہ شاہجہانی ہے۔ باقی خان کا عروج شاہجہان کے زمانہ سے شروع ہوا۔ پہلے ہفت صدی پانصد سوار کا منصب ملا اور اس کے بعد بڑھتے بڑھتے امرار دو ہزار می و دو ہزار سوار میں شریک ہو گئے۔ بادشاہ نے علم، اسپ و فیل عنایت کر کے چہترہ کا فوجدار کیا۔ وہاں جہار سنگھ کے ایک سردار چنپت بندلیہ نے شورش مچائی۔ باقی خان نے

اس کو شکست دی اور اس صلے میں دار الخلافہ میں طلب ہو کر غسل خانے کے داروغہ مقرر ہوئے۔

ان کے فرزند سردار خاں (سردار بیگ) کا ستارہ اقبال عالمگیر کے زمانے میں چمکا، اہتمام جاں نثاب ملا اور دہلی کی شاہی عمارتوں کے داروغہ ہو گئے۔ کچھ دن نہ گزرے تھے کہ اردوے شاہی اور دربار کے کوتوال مقرر ہوئے۔ ان کی کار دانی اور دولت خواہی کا عالمگیر پر اتنا اثر تھا کہ تھوڑے ہی دنوں بعد بعض کارخانجات حرم سرا کی نظارت، فیل خانے کا بندوبست اور شاہی لشکر کا انتظام ان کے سپرد ہو گیا۔ ان کو فقرا سے بڑی عقیدت تھی اور ان کا ظاہر و باطن ایک تھا۔ <sup>۳۳</sup> اللہ میں انہوں نے انتقال کیا۔

ان کے فرزند حمید الدین خاں نے تو عالمگیر کے زمانے میں وہ زور پکڑا کہ بیان سے باہر ہی۔ تمام کارخانجات کا انتظام اور دولت خانہ بادشاہی کا اہتمام ان ہی کے سپرد تھا۔ یہ قسمت بھی ایسی لے کر آئے تھے کہ جس مہم پر ہاتھ ڈالا اس کو سر کیا۔ جو کام سپرد ہوا اس کو پورا کیا۔ عالمگیر نے بھی ان کے اعزاز و اکرام اور ترقی مدارج میں کبھی کوتاہی نہیں کی۔ بڑھاتے بڑھاتے امرائے سہنہ ہزار پانصدی اور دو ہزار سواروں کے طبقے میں شریک کر لیا۔ عادل شاہیوں کے مقابلے میں ان سے بڑے بڑے کارہائے نمایاں ظہور پذیر ہوئے۔ ایک دفعہ عین لڑائی میں سے ان کا ہاتھی نکل بھاگا۔ یہ اس پر سے کود پھر شریک جنگ ہوئے اور



دشمنوں کو مار بہایا۔ ان ہی کارگزاریوں کے صلے میں جیفہ مرصع بگلوس، ہیکمہ مرصع اور فیل انعام میں پایا اور غسل خانہ خاص اور جواہر خانے کے داروغہ ہو گئے۔  
۱۱۱۸ھ میں عالمگیر کا انتقال ہوا۔ ایسے قدر دان بادشاہ کا ان کو جتنا بھی  
صدمہ ہوتا وہ کم تھا۔ لاشس کے ساتھ احمد نگر سے دولت آباد تک پاپادہ آئے  
اور بادشاہ کی قبر کی جاروب کشتی اختیار کی۔ محمد اعظم شاہ نے بڑی منتوں اور  
سماجتوں سے ان کو اپنے ساتھ لیا اور ان کا وہی پہلا رتبہ ان کو عطا کیا۔  
بہادر شاہ کے زمانے میں ان کو عصاے مرصع کے ساتھ خدمت میرتزی کی اور  
داروغگی گزر برداران ملی اور بہادر عالمگیری کے خطاب سے سرفراز ہوئے  
بہادر شاہ کے آخر زمانے تک یہ اسی اعزاز و اکرام کے ساتھ زندگی بسر کرتے  
ہے۔ جب جہاندار شاہ کا عہد حکومت آیا تو ذوالفقار خاں وزیر کے بھر گلے سے  
ان کو قید کر دیا گیا۔ تھوڑے ہی دنوں بعد ذوالفقار خاں کا ستارہ اقبال غروب  
ہوا اور انھوں نے قید سے رہائی پائی۔ لیکن فرخ سیر کے دربار میں ان کو کوئی  
جگہ نہ ملی اور سیف الدولہ عبد بصرہ خاں ناظم پنجاب ان کو اپنے ساتھ لے گیا۔  
محمد شاہ نے تخت نشین ہوتے ہی ان کو بلا بھیجا اور ان کی سابقہ خدمات پر مجال  
کردیا۔ ان کے اثرات اور ان کے اقتدار کا حال دیکھنا ہو تو ماثر الامرا رملہ حنظلہ  
لکھا ہے کہ :

” در آخر عہد خلد مکان مدار سلطنت گردیدہ۔ رفق و رفیق دولت خانہ۔“

بادشاہی و ضبط و ربط کار خانات عمدہ بد و مفوض بود۔ بایں ہمہ  
تیر روی ترکش خلیفہ زمان بودہ چہ در مورچال قلع و چہ در حوالی اردو  
دور دستہا بالمش و تہیہ اشقیات عین می گشت و ہر جا می رفت بہ تکلیک  
پا و ضرب دست مخالف رازدہ و برداشتہ سالم و غام مراجعت می نمود  
و بانواع تحسین اعزاز می اندوخت ازین بود کہ بہ نیچہ عالمگیری زبان زد  
عوام شدہ

شیخ اظہر الدین کی شادی حمید الدین خاں کی لڑکی سے کب ہوئی اس کا پتا  
نہیں چلتا۔ البتہ یہ ضرور معلوم ہوتا ہے کہ محمد شاہ بادشاہ کا زمانہ تھا۔ بھلا ایسے  
بڑے گھرانے میں ان کی شادی ہو اور یہ اراکین سلطنت میں داخل نہ ہو جائیں  
شادی کے بعد ان کو خطاب ”کافی“ ملا اور تھوڑے ہی عرصہ بعد نواب  
مبارک جنگ بہادر کے خطاب اور ہزار روپائی منصب کے ساتھ محمد شاہ بادشاہ  
کے طبقہ امراء میں داخل ہو گئے۔ اس کتذانی کا نتیجہ انعام اللہ خاں یقین ہیں  
انعام اللہ خاں یقین کی تاریخ پیدائش کا پتا چلانا دشوار ہے۔ البتہ ان کی تاریخ  
انتقال سے ان کی تاریخ پیدائش پر کچھ روشنی پڑ سکتی ہے اور اس لئے ہم پہلے  
ان کی تاریخ انتقال سے بحث کریں گے۔ کیوں کہ بعض تذکرہ نویسوں نے اس  
تاریخ کو بھی کسی قدر مشتبہ کر دیا ہے۔ سب تذکرہ نویس اس پر متفق ہیں کہ یہ اپنے  
والد کے ہاتھوں مارے گئے۔ عبدالغفور شاخ نے سخن شعراء میں ”علی ابراہیم خان“

تذکرہ گلزارِ ابرہیم میں طامس ولیم ہیل نے اور نیٹل باؤگر فیکل ڈکٹری میں 'اور  
دی تاسی نے اپنے تذکرہ تاریخ ادب ہندوستان میں لکھا ہے کہ یقین احمد شاہ  
بادشاہ کے عہد حکومت میں مارے گئے۔ چنانچہ ہیل نے اسی وجہ سے ان کا سنہ انتقال  
۱۱۶۳ھ (۱۷۵۰ء) لکھا ہے۔ لیکن میری رائے میں یقین کی یہ تاریخ انتقال صحیح  
نہیں ہے۔ احمد شاہ بادشاہ کا عہد حکومت ۱۱۶۳ھ سے ۱۱۶۶ھ تک تھا۔ میر تقی میر کا  
تذکرہ نکات الشعراء ۱۱۶۲ھ میں فتح علی الحسینی گرویزی کا تذکرہ شعراے ہند  
۱۱۶۵ھ میں اور قیام الدین قائم کا تذکرہ مخزن نکات ۱۱۶۸ھ میں مرتب ہوا۔ ان  
سبھوں نے انعام اللہ خاں یقین کے نہ تو مرنے کے واقعہ کو لکھا ہے اور نہ کوئی ایسا  
لفظ اس میں آیا ہے جو ان کی وفات پر دلالت کر سکے۔ بلکہ ان تذکروں کے  
الفاظ سے پایا جاتا ہے کہ کسی زندہ شخص کا حال لکھا جا رہا ہے۔ مثلاً فتح علی الحسینی  
گرویزی نے ۱۱۶۵ھ میں لکھا ہے:

”بامولف اخلاص دار دو اکثرہا بملاقات می پردازد“

سب سے پہلی کتاب جس میں یقین کے انتقال کا ذکر ہے چھپی نرائین شفیق  
اورنگ آبادی کا تذکرہ ”چمنستان شعرا“ ہے۔ یہ ۱۱۷۵ھ میں مرتب ہوا اور  
اس میں شفیق نے یقین کے انتقال کی تاریخ بھی درج کی ہے۔

۱۷ تذکرہ آب بقا میں یقین کے قتل کا سنہ ۱۱۷۲ھ دیا ہے جس میں اس تحقیق کی داد دیتے بغیر نہیں رہ سکتا۔

شاعرِ نازک سخن و خوش خیال      کرد سفرِ جانبِ ملکِ عدم  
سالِ وصالِش خردِ نکتہ سنج      گفت یقین رفت بسوی ارم

اس سے ۱۱۶۹ھ نکلے ہیں اور میرے خیال میں اس سے زیادہ مستند کوئی شہادت نہیں ہو سکتی شفیق کو یقین کے کلام سے عشق تھا۔ یہاں تک کہ وہ یقین کے وجہ سے میر تقی میر سے بگڑ بیٹھے اور جو کچھ منہ میں آیا میر صاحب کو سنا گئے۔ اب حجت کی جاسکتی ہے کہ دلی کے حالات اورنگ آباد میں شفیق کو کیوں کر معلوم ہو سکتے تھے۔ یہ اعتراض چہستان شعراء کے دیکھنے سے رفع ہو جاتا ہے ۱۱۶۹ھ ہجری میں حکیم بیگ خاں حاکم دہلی سے اورنگ آباد آکر شفیق کے ہاں ٹھہرے اور یقین کے

۱۱۶۹ھ حکیم بیگ خاں حاکم فارسی کے بڑے زبردست شاعر اور نور العین واقف لاہوری کے بڑے دوست تھے ساتھ ہی سیاحی کا بھی شوق تھا۔ دونوں دوست مکہ معظمہ کے ارادے سے نکلے۔ پہلے دہلی میں قیام کیا وہاں سے غلام علی آزاد سے ملاقات کرنے کے لئے اورنگ آباد آکر ٹھہرے اور یہیں شفیق سے ان کی ملاقات ہوئی حاکم نے ہندوستان میں سیاحت کر کے ایک تذکرہ تیار کیا تھا۔ اس کا نام ”مردم دیدہ“ تھا۔ اب یہی شفیق نے حاکم سے یقین کا حال پوچھا۔ انھوں نے جو جواب دیا وہ مجسّمہ نقل کرتا ہوں: ”انعام اللہ خاں یقین در نہ تصع و سستین و ماتہ و الف (۱۱۶۹ھ) ملاقات نمودم۔ مرد خوبی، متواضع بنظر سید اشعار خود بسیار خواند و استعمال تر باک با وجود صغر سنی کہ (۳۰) سی نخواہد بود بحدے داشت کہ تمام رنگ و دیدہ رنگ کہ با گرفت بعد انتقالش اکثر اشخاص در ہماں نہ شہرت دادند و گفتند کہ اس یوسف مصر سخندان جو ریافتہ اخوان ست بل مقول یعقوب ست“ اس بیان میں حافظ کی غلطی کو دخل نہیں کیوں کہ ”مردم دیدہ“ کی کھری نوٹ بکان کے پاس موجود تھی۔ اس بیان سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ یقین کے باپ نے اس کو قتل کیا تھا۔ لیکن جس زمانے میں یہ قتل ہوا اس زمانے میں بھی وجہ نہ معلوم ہو سکی۔ بلکہ یہی سمجھا جاتا تھا کہ باپ کا ظلم اس کے قتل کا باعث ہوا۔

اسی سال مرنے کا حال بیان کیا۔ اسی بیان پر شفیق نے تاریخ انتقال لکھی۔ اس عینی شہادت سے زیادہ اور کیا مضبوط شہادت ہو سکتی ہے۔

احمد شاہ بادشاہ کے زمانے میں یقین کے مرنے کا ذکر سب سے پہلے گلزارِ ابراہیم میں کیا گیا ہے۔ اسی تذکرے سے دی تاسی نے یہ واقعہ لیا اور پھر یہ غلطی پھیلتی ہی چلی گئی۔ تذکرہ گلزارِ ابراہیم ۱۱۹۸ھ کے قریب یعنی یقین کے مرنے کے ۲۹ سال بعد مرتب ہوا۔ اس کے مؤلف نہ دہلی کے رہنے والے تھے اور نہ کبھی دہلی آئے۔ انھوں نے جو کچھ لکھا لوگوں سے سن سنا کر لکھا۔ اس پر غضب یہ ہے کہ انھوں نے کسی بیان کرنے والے کا نام بھی نہیں دیا ہے جس سے معلوم ہو سکے کہ اس شخص کو بھی یقین سے ملنے یا اس کے حالات معلوم کرنے کا موقع تھا یا نہیں۔ بہر حال اس تذکرہ نے جو یقین کا سنہ انتقال درج کیا ہے، وہ قابل یقین نہیں ہو سکتا اور اسی طرح جن تذکروں نے اس سے یہ مضمون لیا ہے ان کی صحت کو بھی تسلیم نہیں کیا جاسکتا۔ مصحفی نے اپنے تذکرہ میں لکھا ہے کہ:

”عمرش زیادہ بربست و بیخ نہ خواہد بود کہ پدرش اوراکشتہ“

گلزارِ ابراہیم میں اس کے متعلق کچھ نہیں لکھا گیا۔ البتہ دی تاسی نے یقین کی عمر ۲۵ سال کی لکھی ہے اور اس کے بعد گلستانِ بے خزان، گلِ رعنا، سخن شعراء، طبقات الشعراء، مؤلفہ مکرم الدین اور ولیم ہل نے ان ہی تذکروں سے یقین کی عمر ۲۵ سال کی قرار دی ہے۔ البتہ قدرت اللہ شوق نے اپنے تذکرہ طبقات الشعراء میں

زرا احتیاط برت کر ”درعین عنفوانِ جوانی پدش کشت“ کے الفاظ سے یقین کی عمر ظاہر کی ہے۔

لیکن بعض واقعات ایسے ہیں جن کی بنا پر یقین کی عمر کا یقین صحیح طور پر نہیں ہوا ہے چہستان شعرا میں حکیم بیگ خاں حاکم کی زبانی لکھا ہے کہ اس زمانہ میں یقین کی عمر تیس سال کے قریب تھی۔ اول تو یہ ایسے شخص کا بیان ہے جو اس زمانہ میں یقین سے ملا تھا دوسرے بعض ایسے حالات ہیں جن کے لحاظ سے بھی بیان صحیح معلوم ہوتا ہے۔

میرے ایک کرم فرما مولوی سید محی الدین صاحب قادری پی۔ ایچ۔ ڈی لندن کے کتب خانہ میں شاہ حاتم کا اصلی دیوان دیکھ کر آئے ہیں۔ اس میں

۱۷۰۰ء میں پیدا ہوئے۔ سپاہی پیشہ آدمی تھے۔ محمد شاہ بادشاہ کے عہد میں نواب عمدۃ الملک کی سرکار میں ملازم ہو گئے۔ آخر میں دنیا سے کنارہ کش ہو کر دہلی دروازہ کے باہر ایک تکیہ میں جا پڑے۔ دہلی میں شاعری کی ابتداء ان ہی سے ہوئی۔ مرزا رفیع سودا کے علاوہ ۲۴ اور شاگرد تھے جن میں سے اکثر اردو کے نامور شعرا ہوئے یہ خود صاحب دیوان تھے۔ اپنے ضخیم دیوان کا خلاصہ کر کے اس کا نام ”دیوان زاوہ“ رکھا۔ ۱۷۶۰ء میں ان کا انتقال ہوا۔

جو دیوان قادری صاحب نے دیکھا ہے وہ پہلے لکھنؤ میں تھا۔ اس کا ذکر ڈاکٹر اسپرنگر نے کیا ہے کہ یہ دیوان خود شاہ حاتم نے ۱۷۶۹ء میں اپنے قلم سے لکھا تھا۔ موتی محل لکھنؤ کے کتب خانہ میں تھا۔ ہر غزل کے اوپر اس کے لکھنے کی تاریخ درج تھی۔ ہر غزل کے ساتھ یہ بھی بتا دیا گیا تھا کہ یہ کس کی طرز پر لکھی گئی ہے۔ خود شاہ حاتم دیوان کے دیباچہ میں لکھتے ہیں ”سرخ غزلیات بہ قسم بقید قلم آورد۔ یکے طرحی دوم فرمایستی۔ سوم جوانی تا تفریق آن معلوم گردد“ (برام پور کے کتب خانے میں بھی اس کا ایک نسخہ موجود ہے)

اس شاعر نے یہ التزام رکھا ہے کہ ہر غزل کے اوپر اس کے لکھنے کے سنہ کے ساتھ یہ بھی بتا دیا ہے کہ یہ غزل کس شاعر کی طرز پر لکھی گئی۔ اس دیوان میں آٹھ غزلیں ایسی ہیں جو حاتم نے یقین کی طرز پر لکھی ہیں۔ ان غزلوں سے میں آئندہ بحث کروں گا۔ یہاں صرف یہ ظاہر کر دینا چاہتا ہوں کہ یقین کی طرز پر جو سب سے پہلی غزل حاتم نے لکھی اس کے لکھنے کا سنہ ۱۱۵۲ ہجری ہے۔ اگر یقین کی تاریخ انتقال ۱۱۶۹ء سے اس کی عمر ۲۵ سال قرار دے کر اس کی پیدائش کا سنہ نکالا جائے تو وہ ۱۱۲۴ء ہوتا ہے۔ ایسی صورت میں یقین نہیں کیا جاسکتا کہ ایک ۸ برس کے لڑکے نے یہ غزل لکھی اور ایسی لکھی کہ حاتم جیسا جگت استاد اس کا تتبع کر رہا ہو۔ اس لحاظ سے حکیم بیگ خاں حاتم کے بیان کو باور کر کے اگر یقین کا سنہ پیدائش ۱۱۴۰ ہجری قرار دیا جائے تو زیادہ صحیح ہوگا۔

یقین کے حالات | یقین کے حالات کا کچھ بتا نہیں چلتا۔ فتح علی حسین گردیزی کا یقین سے بہت دوستانہ تھا۔ مگر افسوس ہے کہ سوائے اس کی تعریفیں کرنے کے ایک لفظ بھی یقین کے حالات کے متعلق اس نے اپنے تذکرے میں درج نہیں کیا۔ قدرت اللہ شوق اپنے تذکرہ طبقات الشعراء میں لکھتے ہیں: ”جو انے بود خوش و خوش گو خوش خلق و قابل منظور نظر“

مصحفی نے لکھا ہے کہ ”جو انے بود مرزا مزاج و شیریں زبان از حسن و جاہت بہرہ وافی داشت“

قیام الدین قائم کا قول ہے کہ :

” یقین ... .. یگانہ عصر و وحید و بہرست باخلاق حمیدہ اتصاف دارد“

کریم الدین نے اپنے تذکرہ طبقات الشعراء میں لکھا ہے کہ :

” وہ ایک جوان نیک رو و خوش خو ۲۵ برس کا تھا جب اس کے باپ نے

اس کو قتل کر ڈالا تھا“

اب اس کے خلاف میر تقی میر کے فقرے سنئے جو انہوں نے نکات الشعراء

میں یقین کے متعلق لکھے ہیں۔ فرماتے ہیں کہ :

” القصر بروپوچے چندے کہ بافتہ است کہ ما و شما نیز می تو ایم بافت

ایں قدر بر خود چیدہ است کہ رعوبت فرعون پیش او پشت دست بر زمین

می گزارد ... .. در بزرگ زادگی و شرافت میاں یقین سخن نیست از خانوادہ

بزرگیت۔ بانبندہ ہم آشنائی سرسری دارد“

خیر منیر صاحب کو تو جانے دو ان کو تو یقین سے کہ تھی جیسا کہ میں آئندہ

ظاہر کروں گا، البتہ دو سکر معاصرین اور ان لوگوں کے بیانات سے جو یقین کے

کچھ ہی بعد گزرے ہیں۔ یہ ضرور معلوم ہوتا ہے کہ یہ ایک شکلیں، وجہ، مرزا منشا اور

خوش خلق، خلیق اور شیریں زبان شخص تھے۔ شادی ہو گئی تھی لیکن یہ معلوم

نہ ہو سکا کہ کہاں ہوئی تھی۔ تین لڑکوں کا پتا تذکروں سے چلتا ہے :

(۱) مرید حسین خان مرید (۲) مصمام اللہ خاں احمد (۳) مقبول نبی خاں مقبول



مرید حسین خاں مرید سب سے بڑے لڑکے تھے۔ ان کا انتقال ۱۲۲۱ھ سے کچھ پہلے ہوا۔ منجھلے لڑکے مصمام اللہ خاں احمد تھے ان کا نام بعض تذکرہ نویسوں نے مصمام الدین خاں بھی لکھا ہے) سپاہی پیشہ آدمی تھے۔ صوبہ جات شرقی میں چلے گئے تھے وہیں ان کا انتقال ہوا۔ چھوٹے لڑکے مقبول بنی خاں مقبول تھے۔ ان کا خطاب نواب مظہر الدین خاں تھا۔ یہ ۱۱۹۲ھ میں فرخ آباد چلے گئے۔ انہوں نے تین سو شعرا کے کلام سے تقریباً ۶۰ ہزار اشعار کا ایک مجموعہ تیار کیا تھا۔ لیکن بد قسمتی سے وہ نذر آتش ہو گیا۔ یہ خوب چند ذکا کے دوست اور میاں نثار اللہ فراق کے شاگرد تھے۔

یقین کو ایفون کھانے کا چسکا پڑ گیا تھا چنانچہ حکیم بیگ خاں حاکم نے لکھا ہے کہ :

” استعمالِ تریاک باوجود صغر سنی کہ (۳) سی خواہد بود بحدے داشت

کہ تمام رنگ رویش رنگ کربا گرفت“

یہ خود بھی اپنے اشعار میں ایفون کی تعریف کرتے ہیں :

جس سے میرے سانفوسے کی لگ ہی ہے جستجو جس طرح ہوتا ہے ایفونی کو ایفون کا تلاش  
ہمیں ماریاہ زلف کے کاٹے سے کیا ہووے کہ ہم ایک عمر سے عادی ہیں خال لب کی ایفون کے

۱۵ ڈاکٹر اسپرنگ نے صوبہ جات شرقی کو اودھ قرار دیا ہے۔ مگر اس زمانہ کی تاریخ کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ صوبہ جات شرقی جون پور اور بہار کو کہتے تھے ۱۱

ان کے دیوان بھر میں کوئی شعر ایسا نہیں ہے جس سے ان کے حالاتِ زندگی کچھ بھی معلوم ہو سکیں۔ البتہ دو اشعار ایسے ہیں کہ ان کی بنا پر کچھ تھوڑی بہت عقل آرائی کی جاسکتی ہے۔ ایک شعر تو یہ ہے:

خاندانِ درد مجھ سے کیوں نہ ہو روشن نقین ہر مرا ہر داغ سینہ میں مصیبت کا چراغ

خواجہ میر درد کا سلسلہ خاندانی خواجہ بہار الدین نقشبندی سے ملتا ہے اور یقین کا بھی سلسلہ ان سے جا کر ملتا تھا۔ ممکن ہے کہ اس سبب انہوں نے اپنے

آپ کو خاندانِ درد میں ہونا بیان کیا ہے۔ دوسرے یہ کہ خواجہ میر درد کے والد خواجہ محمد ناصر یقین کے دادا شیخ عبد الاحد کے خلیفہ شاہ گلشن سے بیعت تھے

اور خواجہ میر درد خواجہ میر اثر اور سارے کا سارا خاندان خواجہ محمد ناصر کا مرید تھا۔

اس طرح شاید شاعر کا یہ مطلب ہو کہ میرے ہی خاندان کی وجہ سے خاندانِ درد

روشن ہے یا یہ بھی ممکن ہے کہ یقین کی شادی خواجہ میر درد کے خاندان میں ہوئی ہو

اور انہوں نے یہ فقرہ فخریہ کہا ہو کہ میرے اس خاندان میں آنے سے اس کو چار چاند لگ گئے

دوسرے شعر میں اپنے کسی عزیز دوست کے مرنے کا افسوس ظاہر کیا ہے۔ الفاظ

تبار ہے ہیں کہ دونوں میں دوستی اور بہت پرانی دوستی تھی

بہ نہیں ہوتا کسی مرہم سے اس سینے کا داغ ہو گیا ناسورِ آخریادیرینے کا داغ

۱۔ شیخ سعد اللہ گلشن نقشبندی فارسی کے بڑے پُرگو شاعر تھے۔ مرزا بیدل کے شاگرد تھے

محمد شاہ بادشاہ کے عہد میں انتقال کیا۔

129057

ان شعروں کے علاوہ سارے دیوان میں (سوائے مرزا منظر کے شاگردی کے اعتراف کے) ایک لفظ بھی نہیں ہے جس سے ان کے حالات کا اظہار ہو سکے۔ یقین کی موت | اس قدر زمانہ کے بعد یقین کے قتل کی وجہ کا معلوم کرنا اب یقیناً ناممکن ہے۔ واقعہ قتل کے زمانہ قریب میں بھی اس بارے میں لوگوں میں اختلاف تھا اور چوں کہ یہ معاملہ ایسا تھا کہ بلحاظ حالات اس پر پردہ ڈالنے کی ہر ممکنہ کوشش کی گئی ہوگی۔ اس لئے افواہوں کی تعداد کا بڑھ جانا ایک لازمی امر تھا۔ بہر حال اس قتل کے متعلق دو وجوہ بتائے جاتے ہیں:

ایک یہ کہ یقین کو اپنے والد کی کسی برائی کی اطلاع ہو گئی تھی اور انہوں نے اس طرح اپنے راز کو فاش ہونے سے بچایا۔ دوسرے یہ کہ خود یقین سے کوئی برائی ہوئی تھی اس لئے اپنے خاندان کو بدنامی سے بچانے کے لئے ان کے والد نے ان کو قتل کیا۔

جس قدر تذکرے میرے پیش نظر ہیں ان کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ پہلی صورت کا اظہار سب سے پہلے حسن نے اپنے تذکرہ شعرا پر اردو میں کیا ہے وہ لکھتے ہیں :-

”می گویند پرش بے گناہ اور اگشت و پارچہ پارچہ کردہ درو یا انداخت  
سببش جنین معلوم شد کہ پرش تعلق خاطر با دختر خود داشت لغو باشد و او از  
چیزها مانعت می کرد۔ برائے اخفائے این حرکت اورا شہید کرد و اکثر جنین

شہادت می دہند۔ خدا بہتر می داند۔“

حسن نے جو افواہ تھی وہ صاف صاف لکھری مگر تذکرہ گلزار ابراہیم میں اس واقعہ کو زرا کنا یہ میں ادا کیا گیا ہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ واقعہ کچھ کچھ ہو گیا۔ اس تذکرے میں لکھا ہے کہ :-

”گوئید بعد احمد شاہ بہادر بنا بر نامائے کہ از یقین صادر می شد اورا پدرش کشت و بدریا انداخت و بعضے گوئید پدرش ارتکاب امرے داشت کہ ممنوع جمیع ادیان بود۔ او منع می کرد۔ پدرش بر آشفت و خوش برخت۔“

اس کا ترجمہ مرزا علی لطف نے گلشن ہند میں کیا۔ لیکن عبارت کو مقفی انبانے کے لئے بعض الفاظ اپنی طرف سے داخل کر دیئے۔ اس طرح معنی بدلنے سے مفہوم میں اس قدر وسعت ہو گئی کہ اب ہر برائی یقین اور اس کے والد کی طرف منسوب کی جاسکتی ہے۔ اصل عبارت اوپر نقل ہو چکی ہے اب اس کا ترجمہ ملاحظہ ہو :-

”مارے جانے کو اس کے بعضے تو یوں نقل کرتے ہیں کہ احمد شاہ بادشاہ کے عہد سلطنت میں بہ سبب کسی حرکت نامعقول کے کہ وہ صادر نہ ہوئی تھی یقین سے، باپ نے اس کے اس کو قتل کیا اور نعرش کو اس کی دریا میں بہا دیا۔ اور بعضے کہتے ہیں کہ ارتکاب اس عمل شنیع کا گزرا تھا اس کے باپ کے دھیان میں کہ وہ ممنوع ہے جمیع ادیان میں۔ یقین نے اس مقدمہ میں باپ کو کشتہ

متنبہ کیا۔ ایک دن اس نے خفا ہو کر اس بچے کا جی ہی لیا۔ علم غیب کا  
 بدستی خدا کو ہی اور یقین گمانوں کا بالکنہ اس خالقِ ارض و سما کو ہے۔  
 یہ حکایت کیا تھی اور کیا سے کیا ہو گئی۔ دی تاسی نے اس واقعہ کو گلزارِ ابراہیم  
 سے لے کر اس کے معنی عجیب و غریب کئے ہیں۔ لکھا ہے کہ :  
 ” بعض لوگ کہتے ہیں کہ اس کا باپ اس کے ساتھ فعل شنیع کرنا چاہتا تھا۔  
 منظر نے اس کی اجازت دیدی تھی مگر یقین نے انکار کیا۔ باپ اس مخالفت  
 ناراض ہوا اور اس کو قتل کر دیا۔ یہ خوف ناک حکایت علی ابراہیم نے بیان کی ہے۔“  
 علی ابراہیم کے الفاظ آپ اوپر دیکھ چکے ہیں۔ معلوم نہیں کہ دی تاسی نے  
 ان کے یہ معنی کہاں سے نکالے۔

صورت دوم کے متعلق طبقات الشعراء مولفہ مقدرت اللہ شوق میں لکھا ہے:  
 ” درعین عفوانِ جوانی پدرش بہ سبب تعصیرے کہ از یقین بوقوع آمدہ باشد گشت“  
 گلزارِ ابراہیم میں صرف ” بنا بر امرنا ملائے کہ از یقین صادر می شد اور پدرش  
 گشت و بدریا انداخت“ لکھ کر واقعہ کو گوگو کر دیا ہے۔ دی تاسی بھی اس واقعہ کو  
 کسی قدر تبدیل کر کے لکھتا ہے :  
 ” یقین کا اپنے باپ سے جھگڑا ہوا اور باپ نے بیٹے کو قتل کر کے اس کی  
 لاش دریا میں بہادی۔“

طبقات الشعراء ہند میں اس الزام سے یقین کو بچا کر لکھا ہے کہ :-

” بہ سبب کسی حرکتِ نامعقول کے کہ وہ صادر نہ ہوئی تھی یقین سے باپ نے  
اس کے اس کو قتل کیا“

سخن شعراء میں عبدالغفور نسخ لکھتے ہیں کہ :

” یقین احمد شاہ بادشاہ کے عہد میں ۲۵ برس کی عمر میں تہمتِ زنا پر اپنے  
والد ماجد کے ہاتھ سے بے گناہ شہید ہوئے“

بزمِ سخن میں بھی اسی واقعہ کو سببِ قتل ظاہر کیا گیا ہے کہ :

” بر تہمتِ زنا از دستِ والدِ خویش بہ قتل رسید و ذائقہ شربتِ شہادتِ حشید“

یلوم ہارٹ نے بھی اسی وجہ کو اس قتل کا باعث قرار دیا ہے۔

ایک تیسرا گروہ مورخین کا ایسا ہے جس نے سب سے زیادہ صحیح راستہ اختیار کیا

ہے۔ اس گروہ کے سر دفتر مصحفی ہیں وہ اپنے تذکرے میں لکھتے ہیں :

” پدرش اوراکشتہ در دیگ مدفون ساخت۔ این سرراکسے کہ میدان میدانند“

نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ نے بھی گلشنِ بے خار میں یہی پہلو اختیار کیا ہے۔ وہ

لکھتے ہیں کہ ::

” پدرش اوراکشت و وجہ قتل ظاہر نہ شد“

کریم الدین نے باوجود اس کے کہ ان کا تذکرہ (طبقاتِ شعرا) زیادہ تر

دی تاسی کے تذکرہ پر مبنی ہی کسی خاص واقعہ کے اظہار سے اجتناب کر کے

لکھا ہے کہ :

” اس کے باپ نے اس کو قتل کر ڈالا تھا یہ نہیں معلوم ہوا کہ اس نے اپنے بیٹے مذکور کو کیوں قتل کیا۔ کیوں کہ محبتِ پدری زیادہ ہوتی ہے نسبت اور فریاد کے لیکن اس جائے خداجانے کیا ایسی حرکتِ ناشائستہ اس سے ہوئی ہے کہ اس کے باپ نے اس کو قتل کیا۔“

گلستانِ بے خزاں میں بھی اس واقعہ کو اسی پہلو سے لیا گیا ہے۔ لکھا ہے کہ :  
 ” اپنے والد کے ہاتھ قتل ہوئے۔ یکسر واللہ عالم کیا سبب تھا جس سبب سے یہ غضب تھا۔“

آپ بقا میں بھی وجہ کا اظہار نہیں کیا گیا اور صرف یہ لکھ دیا گیا کہ :  
 ” ان کے والد نے کسی وجہ سے خنا ہو کر ان کو قتل کیا۔“

مجھے تو قہقہے تھی کہ گلِ رعنا میں مولوی عبدالحی صاحب نے اس واقعہ پر تنقیدی نظر ڈالی ہوگی لیکن یہ دیکھ کر تعجب ہوا کہ انھوں نے واقعہ کو نہایت مبہم طریقے پر بیان کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں :

” پچیس برس کے سن میں یقین کا کام تمام ہو گیا۔“  
 ان تمام صورتوں کے علاوہ دی تاسی نے ایک اور شکل بیان کی تھی کہ :  
 ” محسن کا بیان ہے کہ کسی شرط کے متعلق یقین اور ایک دوسرے نوجوان شخص میں تلوار چل گئی اور یقین مارا گیا۔“

میں نے محسن کا تذکرہ سرِ ابا سخن دیکھا۔ اس میں اس واقعہ کا کہیں اندراج

نہیں ہے۔ یقین کے متعلق اس تذکرے کی پوری عبارت نقل کئے دیتا ہوں:

”انعام اللہ خاں یقین ولد اظہر الدین خاں جوان یوسف جمال پری تمثال نے

عین شباب میں طعمہ شمشیر ہو کے اس جہان سے رحلت کی۔ باشندہ شاہجہاں آباد

شاگرد مرزا منظر جان جاناں۔“

میری سمجھ میں نہیں آتا کہ دی تاسی نے یہ غلط حوالہ دے کر کیوں ایک نئی

حکایت گھڑ لی ہے۔

ڈاکٹر اسپرنگر اور ولیم ہیل نے جو طریقہ اختیار کیا ہے وہ سب سے زیادہ

ہتر اور سب سے زیادہ حاوی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

”اس کے باپ نے اس کو قتل کر دیا کیوں کہ اس کی وجہ سے خاندان کی

بدنامی ہوتی تھی۔“

یہ ایسے جامع الفاظ ہیں کہ جس قدر وجوہ اس قتل کے بیان کئے جائیں وہ

سب اس میں آجاتے ہیں۔

یہ تمام حوالے دینے کے بعد مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس امر سے بھی بحث

کر دی جائے کہ ان حکایتوں پر کہاں تک اعتبار کیا جاسکتا ہے۔ یہ دیکھ کر تعجب ہوتا

ہے کہ ان حکایتوں کے بیان کرنے والے سب کے سب ایسے ہیں کہ نہ تو اس

واقعہ کے وقت دہلی میں موجود تھے اور نہ واقعہ کے بعد کبھی دہلی آئے۔

میر حسن نے ۱۲ برس کی عمر میں (۱۱۶۲ھ میں) دہلی چھوڑی اور پھر کبھی یہاں



نہیں آئے۔ گلزارِ ابراہیم کے مؤلف نے کبھی دہلی کی صورت بھی نہیں دیکھی۔ لطف کا زمانہ بہت بعد کا ہے۔ علاوہ ازیں انہوں نے گلزارِ ابراہیم سے صرف اس واقعہ کو ترجمہ کر کے لکھا ہے اپنی واقفیت کا کوئی اظہار نہیں کیا۔ یقین کا زنا کی تہمت میں قتل ہونا سب سے پہلے نسخہ نے ظاہر کیا ہے۔ یہ تذکرہ ۱۲۸۱ھ میں اس واقعہ کے ۱۱۲ سال بعد لکھا گیا ہے۔ اس زمانے کے کسی مورخ کا حوالہ بھی نہیں ہے۔ ایسی صورت میں اس کو باور کرنے کی کوئی وجہ معلوم نہیں ہوتی۔ اس کے بعد بھیریا چال کی صورت پر لکھی۔ کسی نے ایک تذکرے سے اس واقعہ کو لکھا کسی دوسرے سے۔ کسی نے یقین پر الزام قائم کیا اور کسی نے اس کے باپ پر۔ لیکن جو تذکرہ نويس دہلی کے ہیں اور جن کو وہاں کے حالات معلوم کرنے کا زیادہ موقع تھا انہوں نے صاف بیان کیا ہے کہ اس بات کا پتا نہیں چلتا کہ یہ قتل آخر کس وجہ سے واقع ہوا۔ مصحفی ۱۱۹۰ھ ہجری میں دہلی میں آئے۔ وہ بھی اس معنی کو حل نہ کر سکے اور ان کو لکھنا پڑا کہ ”اس را ہر کہ می دانند می اند“ اس کے دو معنی ہیں اول یہ کہ وہ ان عام اقواہوں کی تردید کرتے ہیں جو ممکن ہے کہ شہر میں اس قتل کے متعلق پھیلی ہوئی ہوں اور دوسرے یہ کہ یقین کے قتل کی وجہ ایک رات ہی جو شاید صرف چند ہی لوگوں کو معلوم ہو۔

۱۵ مجھے معلوم نہ ہو سکا کہ نسخہ نے یہ واقعہ کہاں سے لیا ہے ورنہ اس کے متعلق بھی رائے کا اظہار کرتا کہ اس مؤلف پر اعتماد ہو سکتا ہے یا نہیں ۱۲

میں تسلیم کرتا ہوں کہ نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ کا زمانہ کچھ عرصہ بعد کا ہی لیکن اس معنی کو حل کرنے کے لئے جتنی سہولتیں ان کو تھیں اور کسی کو نہیں ہو سکتی تھیں۔ وہ دہلی کے امرا میں سے تھے۔ ان کا ایسے لوگوں سے میل جول تھا جو نقین کے خاندان کے ہمپا یہ تھے۔ ممکن ہے کہ خود نقین کے لڑکوں سے وہ ملے ہوں لیکن باوجود ان تمام باتوں کے ان کو آخر میں لکھنا پڑا کہ: ”پدرش اور اگشت و وجہ قتل ظاہر شد“ جب دہلی میں رہنے والوں کو یہ حال معلوم نہ ہو سکا تو پھر باہر والوں کو یہ کیسے معلوم ہو سکا تھا جو کچھ انہوں نے لکھا محض افواہ پر لکھا اور افواہ پر کسی واقعہ کا قیاس خلاف احتیاط ہے جو لوگ دہلی والے ہیں یا دہلی میں کبھی رہے ہیں وہ جانتے ہیں کہ ایسی بے سرو پا افواہیں پھیلانے میں یہاں والوں کو کیا کمال حاصل ہے۔ یہاں کے لوگوں کی طبیعتیں عجبت پسند واقع ہوئی ہیں۔ اگر کسی خبر میں عجبت کا پہلو ہے اور ساتھ ہی کسی کی برائی بھی نکلتی ہے تو ایسی خبر سیلاب کی طرح بڑھتی ہے اور آگ کی طرح پھیلتی ہے۔ نئے نئے حاشے چڑھائے جاتے ہیں، طرح بہ طرح کی رنگ آمیزی کی جاتی ہے اور تھوڑے ہی دنوں میں یہ خبر کچھ سے کچھ ہو جاتی ہے۔ دہلی کی تاریخ اٹھا کر دیکھو، اکثر خون خرابے انہیں افواہوں سے ہوئے ہیں۔ نادر شاہ دہلی میں بیٹھا تھا، جانوں پر نبی ہوئی تھی، لیکن پھر بھی یہاں والے اپنی طبیعتوں کو نہ روک سکے اور آخر قتل عام کراہی دیا۔ یہاں کے کسی واقعہ کی دریافت میں ”می گوئید“ یا ”کہتے ہیں“ یا ”سنتے ہیں“ پر اعتماد کرنا نہایت

خطرناک ہے۔ چنانچہ خود اسی واقعہ کو دیکھ لو ہر تذکرے میں قتل کے دو تین مختلف وجوہ بتائے گئے ہیں لیکن جو لوگ یہاں والوں کی حالت سے واقف تھے، یہاں رہتے تھے اور جن کو واقعی اصل حال معلوم ہو سکتا تھا، ان کو دریافت کے بعد بھی لکھنا پڑا کہ: ”یہ قتل ایک رازِ سرسبستہ ہے، بس جو جانتے ہیں وہی جانتے ہیں“ اب رہے تذکرے تو ان کی کچھ نہ پوچھو۔ ایک نے کچھ لکھا۔ دوسرے نے اس سے روایت لی۔ مگر انہی طرف سے تھوڑا بہت کچھ اور بڑھا دیا۔ تیسرے نے اس کا ترجمہ کر کے رنگ ہی بدل دیا۔ اس لئے میں یقین کے قتل کے متعلق صرف یہ کہہ سکتا ہوں کہ ان کے والد نے ان کو کسی ایسی وجہ سے قتل کیا جس کا پتا چلنا اب ناممکن ہے کیوں کہ یہ راز صرف چند لوگوں کو معلوم تھا اور وہ ان کے ساتھ دفن ہو گیا۔

کچھ تو بات ہے کہ شاعر ”تلمیذ الرحمن“ کہا جاتا ہے۔ آمدِ سخن کے وقت اس کو الہام سا ہوتا ہے۔ یقین ہی کو دیکھ لو اپنے عالمِ جوانی میں قتل ہونے کو اپنے کلام میں کسی جگہ بانڈھ گئے ہیں۔ لکھتے ہیں ۵

زمانہ میں جو عاشق ہیں تمنا میں ہیں جینے کی ہمارا جی نکلتا ہے یقین مرنے کی حسرت پر  
 کمزور ہو چکے تھے، جانتے تھے کوئی دن میں مر جائیں گے بھلا ”مرتے کو  
 ماریں شاہ مدار“ بننے سے کیا فائدہ ایسوں کو جینے دو شاید کسی کام آجائیں ۵  
 یہ بہار آپ مرجاتا جو جیتا ان کے کام آتا یقین کو مار کر زور آوراں کے ہاتھ کیا آیا

دو شعر تو ایسے ہیں کہ اگر ایک طرف ان کے عشق کا کچھ حال کھولتے ہیں تو دوسری طرف ان کی پاکبازی کی قسم کھاتے ہیں۔

دوسرے شعر کے تیور بتا رہے ہیں کہ کئے والا اپنا سچا سچا حال بیان کرنا ہی اس میں ریاکاری نام کو نہیں ہے۔

یقین مارا گیا جرمِ محبت پر ہے طالع شہادت اس کو کہتے ہیں سعادت اس کو کہتے ہیں۔

گرچہ ہوں غرقِ بختِ عشق میں خواہاں کے یقین لیک نامن ہی مرا گل کی طرح پاک ہونے

تمنہ | انعام اللہ حال یقین حضرت مرزا منظر جان جاناں کے شاگرد تھے سوائے کمال کے بقیہ سب تذکرہ نویسوں نے ان کو ان ہی کا شاگرد لکھا ہے۔ اور خود

انہوں نے بھی حمد، نعت اور منقبت کے بعد اپنے استاد کی تعریف کی ہے۔ جوں نماز اپنے یہ صبح و شام لازم کرتے تھے

حضرت استاد یعنی شاہ منظر کی شننا ایک اور جگہ لکھتے ہیں۔

مجھے ہے پھر کو کیا ہی جوں نگیں حرفِ شننا کون بچا نے یقین بن حضرت منظر کی قدر

سب تذکرہ نویس اس پر متفق ہیں کہ انہوں نے سوائے مرزا صاحب کے اور کسی کے سامنے زانوئے تلمذتہ نہیں کیا معلوم نہیں کہ پھر کمال نے ان کو

سودا کا شاگرد کس طرح لکھ دیا۔

بعض تذکرہ نویسوں کی عنایت سے یہ خیال پیدا ہو گیا ہے کہ یقین نہ شعر

کہہ سکتے تھے اور نہ سمجھ سکتے تھے ان کا سارے کا سارا دیوان مرزا منظر جان جانال کا کہا ہوا ہے۔ میں اس بارے میں زرا وضاحت سے بحث کرنا مناسب سمجھتا ہوں۔ جس قدر تذکرے میری نظر سے گزرے ہیں ان کے لحاظ سے مولفین کو چار قسموں پر تقسیم کیا جاسکتا ہے:

ایک وہ جنہوں نے اس واقعہ کا ذکر ہی نہیں کیا۔

دوسرے وہ جنہوں نے ”میگویند“ کے عنوان سے صرف اس واقعہ کا ذکر کیا ہے

تیسرے وہ جنہوں نے اس واقعہ کی تائید کی ہے۔ اور

چوتھے وہ جنہوں نے اس واقعہ کی تردید کی ہے۔

مولفین کا سب سے بڑا گروہ طبقہ اول میں آتا ہے۔ ان میں بعض وہ لوگ ہیں جو اس زمانہ میں

دہلی میں تھے یا وہ ہیں جن کو اس واقعہ کی تصدیق کے بہت مواقع تھے۔ ان سب کا اس

واقعہ کے متعلق کچھ نہ لکھنا ایک حد تک اس بات کی دلیل ہو سکتا ہے کہ یا تو کوئی ایسی بات

ہی نہیں تھی اور اگر تھی تو وہ ایسی افواہ تھی جس پر اعتماد نہیں کیا جاسکتا تھا۔ اس گروہ

میں فتح علی گروہی (تذکرہ شعراء ہند) قیام الدین قائم (مخزن نکات) کریم الدین (طبقات لشعرا)

عبدالغفور ساخ (سخن شعراء) قطب الدین باطن (گلستان بے خزاں) سید

علی حسن خاں (نبرہ سخن) مرزا جعفر علی (آب بقا) بلوم ہارٹ (فہرست کتب قلمی

انڈیا آفس) محسن (سراپا سخن) اور شیفتہ (گلشن بے خار) شریک ہیں۔

کریم الدین نے تو یہاں تک لکھا ہی کہ میں نے اس شخص (یعنی) کی تعریف بہت

لوگوں کی زبانی سنی ہے“

طبقہ دوم میں مصحفی (تذکرہ ہندی) علی ابراہیم خاں (گلزار ابراہیم)  
مرزا علی لطف (گلشن ہند) ولیم ہیل (اورینٹل بائیو گرافیکل ڈکشنری) خواجہ  
حمید الدین اورنگ آبادی (تذکرہ بزم گلشن گفتار) شامل ہیں۔ مصحفی نے لکھا ہے کہ:  
”گوئید مرزا جان جاناں بسیار دوست داشتے و اکثر بہ خانہ اش شرباً  
روز و روز را شرب کردے۔ دیوانش از نظر مرزا بخوبی گزشتہ بلکہ بقول بعضے  
ہمہ کلامش گفتہ مرزا است“

گلزار ابراہیم اور گلشن ہند میں بھی اس واقعہ کو محض افواہ اور گمان پر محمول  
کیا گیا ہے۔ عبارت یہ ہے:

”اکثر یہ گمان باشندگان <sup>عشائیر</sup> ہجان آباد تھا کہ نقین فن شعر و شاعری میں  
محض بے استعداد تھا مرزا منظر خود شعر کہتے تھے اور نام اس کا داخل شعرا  
کرتے تھے“

تذکرہ بزم گلشن گفتار میں بھی اسی مضمون کو دوسری طرح ادا کیا گیا ہے کہ:  
”در خدمت مرزا رسوخ تمام داشت بنا بر این مرزا خود بہ تخلص نقین ارشاد  
فرمودند“

ڈاکٹر اسپرنگر اور ولیم ہیل نے ”ہمہ کلامش“ کو ”اکثر اشعار“ سے بدل کر  
لکھا ہے کہ:

” مرزا منظر کے شاگرد تھے۔ ہستاد کو ان سے ایسی محبت تھی کہ ان کے اکثر اشعار ان کو لکھ دیتے تھے۔“

ان میں سے ایک مولف بھی ایسا نہیں ہے جو یقین کے زمانے میں موجود ہو اور جس نے خود اس افواہ کو سنا ہو۔ گویا ان لوگوں کو یہ خبر افواہ ورافواہ ہو کر پہنچی ہے اور افواہ ہی سمجھ کر انہوں نے اس کے متعلق اپنی کوئی رائے ظاہر نہیں کی ہے۔

طبقتہ سوم میں میر تقی میر (نکات الشعراء) حسن (تذکرہ شعرائے اردو) اور گارسان دی تاسی (تذکرہ ادب ہندوستان) شامل ہیں۔ ان سب کی قنیت کا دارومدار میر صاحب کے تذکرہ (نکات الشعراء) پر ہے۔ معلوم نہیں کہ میر صاحب کو یقین سے اتنی کد کیوں تھی کہ اس افواہ کو ثابت کرنے کے لئے طرح طرح کے حوالے دیئے ہیں۔ چونکہ میر صاحب ہی کے بیان پر یہ ساری عمارت کھڑی ہوئی ہے اس لئے جو کچھ انہوں نے اس بارے میں لکھا ہے اس کو پورے کا پورا یہاں نقل کر دیتا ہوں تاکہ واقعات کے ساتھ میر صاحب کا جوش بھی ظاہر ہو سکے:

” بعد از ملاقات این قدر معلوم شد کہ ذائقہ شعر فہمی مطلق ندارد۔ شاید از ہمیں

راہ مردمان گمان ناموزونیت در حق اوداشتہ باشند۔ جمعے بر این اتفاق

دارند کہ شاعری او خالی از نقص نیست۔ چرا کہ شاعر این قسم کم فہم نمی باشد

از شخصے منقول است کہ بخاندہ عطیہ اللہ خاں کہ پسر نواب عنایت اللہ خاں مرحوم

یا شد یقین نشسته بود وی گفت ازاں روزے کہ مرزا دست استادی  
 در سر من داشته است شعر من ترقی کرده شخص مذکور این مصرع نظامی پیش حصار  
 مجلس باواز لبند خواند مصرعہ شد آن مرغ کو قایہ ز ترس نہاد - حاصل اور بیضہ  
 در کلاہ شکست - میاں شہاب الدین ثاقب کہ احوال او نوشتہ خواہ شد نقل می کرد  
 کہ من محض برائے امتحان بجانہ اور فتم و یک غزل طرح کردم من غزل بانصرام  
 رسانیدم و از مصرعے موزوں نہ شد و اللہ اعلم -

میاں محمد حسین کلیم کہ احوال گزشت قصیدہ گفتہ بہت مسمی بہ روضۃ الشعراء  
 در و نام تمام شعراء را نقل کردہ ازاں جملہ نام ایشان نیز آوردہ لیکن بجا یہ  
 غریبے کہ سخن فہم می فہم و آں نیست

۱۰ شہاب الدین ثاقب - بارہ کے رہنے والے تھے - دہلی میں آ رہے تھے - پہلے میاں آبرو کے  
 شاگرد ہوئے اس کے بعد ان سے ٹوٹ کر سراج الدین علی خاں آرزو سے آئے - فقیرانہ زندگی بسر  
 کرتے تھے - باوجود ان کے بیان کو قبول کرنے کے میر صاحب ان کو بھی کچھ اچھا آدمی نہیں سمجھتے  
 فرماتے ہیں - "تحفہ روزگار مست - در ہمہ چیز دست دارد و بیچ نمی داند"  
 ۱۱ شیخ محمد حسین کلیم دہلوی - یہ میر تقی میر کے بہنوئی ہیں - احمد شاہ بادشاہ کے زمانہ میں پولیس میں  
 ملازم تھے اور اپنے علم کی وجہ سے ہر جگہ غرت کی نظر سے دیکھے جاتے تھے - رسالہ علم عروض و  
 قافیہ اور ترجمہ فصوص الحکم ان سے یادگار ہیں - خود بھی شاعر تھے - اردو اور فارسی دونوں  
 زبانوں میں شعر کہتے تھے - ان کی بعض مثنویاں بہت مشہور ہیں - دیوان میں غزلیں، قصیدے  
 محسن اور رباعیاں ہیں - ان ہی قصیدوں میں قصیدہ روضۃ الشعراء ہے - احمد شاہ ہی کے  
 زمانہ میں ان کا انتقال دہلی میں ہوا - ۱۲



یقین کے شعروں پہ ہیں بدگمان بعضے کہ اس کے یہ

غلط ہی ہم نے پوچھا ہے گا مرزا جانِ جاناں کو

اس میں پہلا جو واقعہ دیا ہے معلوم ہوتا ہے کہ وہی فساد کی جڑ ہے۔ یعنی یہ کہ میر صاحب نے یقین سے ملاقات کی اور اس کو کم فہم پایا۔ اب اس واقعہ کے ساتھ ان حالات پہ بھی نظر ڈالئے جو اس ملاقات میں پیش آسکتے ہیں۔ دنیا بھر جانتی ہے کہ میر صاحب بلا کے بددماغ آدمی تھے۔ یہ جا کر یقین کے دادا سے ملے۔ وہ ان کے ساتھ برابر ہی سے پیش آئے، دعوت کی، شعروشاعری ہوئی۔ یہ سرسہند سے خوش خوش آئے اور شیخ عبدالاحد کی تعریف اپنے تذکرہ میں بے ضرورت کر دی۔ اب یہ یقین سے ملتے ہیں۔ وہ سرسہند کے فقیر کا گھر تھا یہ وہلی کے ایک امیر کا محل ہے۔ وہاں ایک جہاں دیدہ بزرگ تھے اور یہاں ایک نوجوان لڑکا وہاں انکساری تھی اور یہاں مرزا ملتشی اور نازک فراچی، وہاں کسی کو بربری کا دعویٰ نہ تھا اور یہاں یہ زور تھا کہ

یقین تائیدِ حق سے شعر کے میدان کا رستم ہے

مقابل آج اس کے کون آسکتا ہے کیا قدرت

بھلا ایسی صورت میں میر صاحب کا سرسہند والا رنگ ڈھونڈنا تحصیل حاصل تھا ان کے کسی شعر کی تعریف نہ کی ہوگی جو یقین کو کم فہم ٹھیرا کر صلوات میں سنانے پر اتر آئے۔ معلوم ہوتا ہے کہ اسی ملاقات کی وجہ سے یہ خیالات یقین کے متعلق

ظاہر کئے گئے ہیں :

” برو پوچھے چندے کہ بافتہ است کہ ماوشما نیر می تو انیم بافت - اس قدر

برخود چہرہ است کہ رعوت فرعون پیش او پشت دست بر زمیں می گزارو“

کیوں کہ اس کے بعد ہی لکھتے ہیں کہ:

” بعد از ملاقات این قدر معلوم شد کہ ذائقہ شعر فہمی مطلق ندارد“

دوسرا واقعہ کس کی زبانی سنا اس کا اظہار نہیں کیا گیا۔ میری سمجھ میں

نہیں آیا کہ نظامی کے مصرعہ میں وہ کون سی بات تھی جس سے ”یقین“ راہیضہ

در کلاہ شکست“ کی صورت پیدا ہوئی تھی۔ اگر مرزا منظر کا انتقال ہو گیا ہوتا یا

اصلاح ترک کرنے سے یقین کی شاعری گر گئی ہوتی یا کوئی ایسی وجہ ہوتی جس کے

باعث یقین کو شرمندہ ہونا پڑتا تو البتہ یہ قصہ بامعنی اور بر محل ہوتا۔ یہاں بولیں

اتنا معلوم ہوتا ہے کہ جس کسی نے یقین کے خلاف کچھ کہا اس کو میر صاحب نے

خدا کی دین سمجھ کر اپنے تذکرے میں جگہ دیدی۔

تیسرا قصہ میاں شہاب الدین ثاقب کی زبانی نقل کیا ہے۔ بھلا کیا ثاقب او

کیا ثاقب کی شاعری۔ بڑھے پھولس۔ فقیر آدمی آبرو کے شاگرد، ان کو انعام اللہ

خاں یقین جیسا لونڈا کیا خاطر میں لاتا۔ آپ جس طرح اس کا امتحان لینے گئے

تھے، اسی طرح منہ کی کھا کر واپس آئے۔ جلے ہوئے تو پتھر مارتے ہیں، انہوں نے

بھی اس کو نالائق مشہور کر دیا۔

بات یہ ہے کہ اچھا شاعر شعر اسی وقت کہتا ہے جب طبیعت حاضر ہو۔ کلام میں آمد کا رنگ ہے اور لفظوں اور بندشوں پر غور ہو سکے نہ اس طرح کہ ثابت ہے کوئی صاحب آکر کہیں کہ لیجئے یہ طرح ہے میں بھی کہتا ہوں، آپ بھی کہئے چھوٹے موٹے شاعر تو اس پر تیار ہو جائینگے مگر وہ لوگ جو واقعی شاعر ہیں وہی کرینگے جو یقین نے کیا کہ خالی کا غزوہ واپس کر دیا۔ اگر ایک آدھ مصرعہ بھی لکھ لیا ہوتا تو یہ خیال ہو سکتا تھا کہ اس نے طبیعت پر زور ڈالا ہے۔ سادہ کا غزوہ واپس کر دینے کے یہی معنی ہو سکتے ہیں کہ اس نے ایسی لغویات میں پڑنا نہیں چاہا۔

چوتھا واقعہ محمد حسین کلیم کا ہے۔ کلیم کا شعر موجود ہے۔ ہر شخص اس کے معنی کر سکتا ہے۔ مگر میر صاحب نے اپنے مطلب کے معنی پہنا کر لکھا ہے کہ :

” نام ایشاں را نیز آوردہ لیکن بکنا یہ غریبے کہ سخن فہم می فہم۔“

سارے قصیدہ میں بچارے کلیم نے کسی شاعر کے متعلق کنا یا کوئی بیان نہیں کیا ہے اور کیا ہے تو یقین کے لئے۔ جو شخص اس شعر کے وہ معنی سمجھے جو میر صاحب چاہتے ہیں وہ تو ”سخن فہم“ ہی ورنہ ”کم فہم“ اور ”ذائقہ شعر فہمی مطلق نہ دارد“

زرا آگے چل کر یقین کے ایک شعر کے متعلق لکھتے ہیں کہ :

” لیکن شعر یقین لفظاً لفظاً متبدل رائے انذرام مخلص ست “

اے رائے انذرام مخلص۔ ذات کے کھتری اور دہلی کے رہنے والے تھے۔ مرزا پیدل اور خان آرزو سے اصلاح لیتے تھے۔ ان کا اکثر کلام زبان فارسی میں ہے۔ مدتوں نواب اعتماد الدولہ وزیر کے کتب خانے میں فوت ہوئے۔

اور ساتھ ہی اس کے مخلص پر بھی ہاتھ مار دیا ہے۔ فرماتے ہیں کہ :

” طرفہ تر این کہ آں ہم در سلیقہ سرقہ یکہ بودہ است “

بہر حال واقعات کے لحاظ سے مجھے میر صاحب کی رائے پر اعتماد کرنے میں

زرا تامل ہوتا ہے۔ ہاں یہ مان لینے میں مجھے کیا کسی کو بھی تامل نہیں ہو سکتا کہ

بلحاظ تعلقات (جس کا میں آئندہ ذکر کروں گا) مرزا منظر کو اپنے اس شاگرد سے

خاص انس تھا اور انہوں نے ان کے کلام کی اصلاح خاص طور پر کی ہے۔

میر صاحب کو چوں کہ یقین کے خلاف الزام قائم کرنا تھا اس لئے پہلے تو

یہ ثابت کیا کہ یقین کو شعر کہنا نہیں آتا تھا، مرزا منظر ان کو غزلیں لکھ دیا کرتے

تھے، اس کے بعد جو ستم ظریفی کی ہے وہ دیکھنے کے قابل ہے فرماتے ہیں کہ :

” میان یقین را مردماں می گفتند کہ مرزا منظر اور اشعار گفتہ می دهد و وارث

شعر ہائے ریختہ خود گردانیدہ۔ از قبول کردن این معنی بندہ را خندہ می آید کہ

ہمہ چیز بوارث می رسد الا شعر۔ مثلاً کہے بر شعر پر خود یا بر مضمون او متصرف نشود

ہمہ کس اوزا و زرد خواہند گفت تا بشعر استاد چہ رسد “

یعنی آپ فرماتے ہیں کہ لوگوں کا یہ خیال ہے کہ یقین کو مرزا منظر نے اپنے

شعروں کا وارث کر دیا تھا۔ میری رائے میں ایسے وارثوں کو چور کہتے ہیں۔ گویا

ایک طرف تو یقین کو ناکارہ ثابت کر کے راستہ بند کر دیا۔ دوسری طرف

وارث کے خیال کی تردید کر دی۔ اس کے بعد دو ہی صورتیں رہ گئیں کہ یا تو

یہ مان لو کہ یقین کا سارا دیوان مرزا منظر کا ہی یا یہ تسلیم کرو کہ یقین نے ان کے شعروں کا سرقہ کیا ہے۔

بس میر صاحب ہی ایک شخص ہیں جنہوں نے اس واقعہ کو دنیا میں پھیلایا۔ اس کے بعد ہر ایک نے ان سے سندیٰ شروع کی۔ خود کسی نے تحقیق کی تکلیف گوارا نہیں کی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ تھوڑے ہی عرصہ میں میر صاحب کے الفاظ بدل کر کچھ اور ہی ہو گئے۔ میر حسن اپنے تذکرہ شعراے اردو میں لکھتے ہیں کہ :

” میر تقی در تذکرہ خود نوشتہ است کہ مشہور چین ست کہ مرزا منظر تمام دیوان گفتہ دادہ است خود موزوں نیست مرا یقین نہ بود لیکن مرزا رفیع سودا و میر سوز سلما اللہ گواہی دادند کہ روزے مایاں در خانہ العوام اللہ خان رفتہ برائے امتحان مصرعے طرح نمودیم۔ ہر چند مبالغہ کر دیم یک مصرع موزوں نکرد ذاتقہ سخن فہمی ہم نہ داشت“

اس کے بعد میر حسن خود اپنے خیالات لکھتے ہیں کہ :

” واللہ اعلم، باشد مارا ازیں چه کار۔ متاع تیک ہر دو کاں کہ باشد“  
مجھے یہ دیکھ کر تعجب ہوتا ہے کہ میر حسن نے عبارت بالاکہاں سے پیدا کر لی نکات لشعرا میں تو یہ کہیں نہیں ہے۔ جو واقعات اس میں دیئے ہیں ان سے میں اوپر بحث کر آیا ہوں شاید نکات لشعرا کا کوئی دوسرا نسخہ دیکھا ہوگا جو نسخہ انجمن ترقی اردو نے چھاپا ہے اس میں تو یہ فقرہ موجود نہیں ہے۔ یہی کیا ہے۔ دی تاسی اس سے بھی کچھ زیادہ

لکھتے ہیں اور وہ بھی نکات الشعراء ہی کا حوالہ دیتے ہیں۔ دیکھئے اس طرح پر کا کو  
بن جاتا ہے۔ دی تاسی نے میر صاحب کے حوالے سے لکھا ہے کہ:

” اس شاعر (یقین) کی شہرت اگرچہ بہت زیادہ ہے لیکن جتنا کہا جاتا ہے اتنا  
نہیں ہے۔ . . . . اور اس کو اس لئے بھی بُرا کہا جاتا ہے کہ یہ بعض دوسرے  
شاعروں کی طرح کہیں تو دوسروں کے مضمون چرا لیتا ہے اور کہیں مصرعے  
. . . . . اور مجھے اچھی طرح معلوم ہے کہ یقین کو نہ تو شعر کہنے کا مادہ تھا اور  
نہ شعور تھا۔“

ذرا ان الفاظ کو نکات الشعراء کے مضمون سے ملا کر دیکھئے۔ کیا میر صاحب کا یہی  
مطلب تھا جو دی تاسی نے لیا ہے۔ بہر حال انعام اللہ خاں یقین کو نالائق ٹھہرانے میں  
بس میر صاحب ہی میر صاحب ہیں۔ انہوں نے اس پر ہی بس نہیں کی ہے بلکہ توارک کا  
بھی الزام بیچارے پر لگا دیا ہے اور تائید میں صرف ایک شعر لکھ کر چپ ہو گئے ہیں  
یقین کا شعری سے

کیا بدن ہو گا کہ جس کے کھولتے جامہ کا بند برگ گل کی طرح ہر ناخن معطر ہو گیا  
میر صاحب اس پر اعتراض کرتے ہیں کہ یہ شعر ” لفظاً لفظاً تبدیل رائے اندر  
مخلص است سے

ناخن تمام گشت معطر جو برگ گل بندے قبلے کسیت کہ وامی کنیم ما  
اس بحث کو کچھی نرائین شفیق نے اپنے تذکرہ چہستان شعرا میں بہت وضاحت سے

لکھا ہے اور میر صاحب کو بہت بُرا بھلا کہہ کر بتایا ہے کہ تو ارد اور تبدل کس کو کہتے ہیں  
 مجھے اس بحث میں جانے کی ضرورت نہیں کیوں کہ اول تو ایک شعر کی بنا پر کسی  
 شاعر پر یہ الزام قائم نہیں کیا جاسکتا کہ وہ سہرۃ کا عادی ہے یا اس کے ہاں تو ارد  
 کثرت سے واقع ہوتا ہے۔ دوسرے ایک زبان سے دوسری زبان میں کسی شعر کا  
 ترجمہ کرنا نہ معیوب ہے اور نہ اس کو تو ارد کہا جاتا ہے اگر اسی چیز کو تو ارد سے تعبیر  
 کیا جائے تو شاید زبانِ اُردو کا تو ایک شاعر بھی نہ رہے جس کو سارق نہ کہا جاسکے  
 ہمارے یہاں کی شاعری بالکل ایک محدود دائرہ میں ہوتی ہے۔ ایک شاعر جو مضمون  
 باندھ گیا ہے اسی کو الٹ پلٹ کر دوسرا باندھتا ہے۔ کبھی دوسری زبان کے اشعار سے  
 ترجمہ کرتا ہے۔ غرض اس طرح اگر ایک طرف حدت پیدا ہو جاتی ہے تو دوسری طرف  
 مضمون میں اضافہ ہوتا ہے۔ اگر صرف ایک شعر کے ترجمہ کی بنا پر یہ الزام قائم کیا جائے  
 کہ یقین دوسرے اشعار کے مضامین کا سہرۃ کرتا تھا، تو میر اور سودا جیسے شاعر بھی  
 اس الزام سے نہ بچ سکیں گے۔ نمونہ کے لئے سودا اور میر کا ایک ایک شعر  
 دیدیتا ہوں تاکہ معلوم ہو سکے کہ یہ لوگ بھی ترجمہ کو معیوب نہیں سمجھتے تھے۔ سودا کا یہ شعر  
 آلودہ قطراتِ عرق دیکھ جبیں کو      اخترِ پے جھانکے ہیں فلک پر سے زمیں کو  
 قدسی کے اس شعر کا ترجمہ ہے  
 آلودہ قطراتِ عرق دیدہ جبیں را      اخترِ فلک می نگردے ز زمیں را

میر صاحب کا یہ شعر ہے

عام حکم شراب کرتا ہوں محتسب کو کباب کرتا ہوں

حضرت امیر خسرو کے اس شعر کی نقل ہے

عام حکم شراب می خواہم محتسب را کباب می خواہم

میر اور سودا ہی پر کیا موقوف ہے جب سے اردو کی بنیاد پڑی اس وقت سے

دوسری زبان سے ترجمہ کرنے کو جائز سمجھا گیا ہے اردو کے باوا آدم "ولی" کو

دیکھئے حسن کے شعر ہے

شب مرا تا بروز خواب بود در دو چشم بغیر آب نہ بود

کا لفظی ترجمہ کر دیا ہے۔

آج گی رہیں مجھ کو خواب نہ تھا دونوں آنکھوں میں میری آب نہ تھا

غرض یقین پر میر صاحب کا یہ الزام بہت ہی کمزور ہے۔ مخالفت میں لکھ گئے۔

یہ نہ سمجھے کہ جو اصول میں قائم کر رہا ہوں اس سے خود بھی نہیں بچ سکتا۔ شفیق

اورنگ آبادی نے تذکرہ چمنستان شعرا میں اس بارے میں بہت کچھ لکھا ہے۔

نتیجہ وہی ہے جو میں نے نکالا ہے۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ اس کے پڑھنے سے یہ معلوم

ہو جاتا ہے کہ "نوارد" اور "متبدل" کس کو کہتے ہیں۔ اور کون سی صورتوں میں

یہ الزام کس شاعر پر عاید کیا جاسکتا ہے۔

چوتھا طبقہ ان تذکرہ نویسوں کا ہے جنہوں نے اس الزام کی تردید کی ہے۔



ان میں سے ایک تو یقیناً ہیں جن کا ذکر میں توارد کی بحث میں کر آیا ہوں۔ دوسرے قدرت اللہ شوق ہیں اور تیسرے مولوی عبدالحی صاحب شوق نے لکھا ہے کہ:

” بعض شعراء گمان بردہ اند کہ یقیناً شعر گفتن نبی دانست۔ مرزا منظر اورا

شعرا گفتہ می داد محض خطاست۔ فاما در اشعارش اکثر اصلاح استاد بشیرت چیرے مضائقہ ندارد“

شوق نے یہ تذکرہ دہلی میں ۱۱۸۸ھ میں تکمیل کو پہنچایا۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ مرزا منظر زندہ

تھے یقیناً کے دیکھنے والے لوگ موجود تھے۔ خود شوق اپنی علمی قابلیت کی وجہ سے

وہاں مرجع خلایق تھے۔ ایسی صورت میں قیاس ہی ہو سکتا ہے کہ جو کچھ انہوں نے

لکھا بعد تحقیقات لکھا۔ یا ان کا ایسے صاف صاف الفاظ میں اس واقعہ کی تردید کرنا

ظاہر کر رہا ہے کہ ان کو اپنی تحقیقات پر اعتماد ہے اور وہ اس افواہ کو ”محض خطا“

سمجھتے ہیں۔ چونکہ مولوی عبدالحی صاحب کا زمانہ بہت بعد کا ہے اور بطور خود تحقیقات

کرنے کا انہیں موقع نہ تھا اس لئے انہوں نے اس واقعہ کی تردید کا دوسرا

پہلو اختیار کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ:

” میر صاحب کی زبردستی دیکھو یقیناً کا دیوان ان کی سخن گوئی کی زندہ

شہادت موجود ہے۔ ایسے سخن گو کی سخن فہمی سے انکار کرنا میر صاحب کی زبان سے

اچھا نہیں لگتا“

یہ تو وہ رائے ہے جو دوسرے تذکروں کے بیانات پر قائم کی گئی یا قائم کی جاسکتی

ہے۔ اب میں خود اپنی رائے کا اظہار کرتا ہوں اگرچہ میں جانتا ہوں کہ میں کیا اور

میری رائے کیا۔

”تو اردو اور تبدیل“ کے متعلق اوپر بحث کر آیا ہوں آگے چل کر میں اور اشعار بھی دوں گا اور دکھاؤں گا کہ یقین نے دو سکر شاعروں سے مضمون لے کر اس کو کیا سے کیا کر دیا ہے۔ یہاں میں صرف اس الزام سے بحث کرنا چاہتا ہوں کہ یقین خود شاعر نہ تھا بلکہ اس کا تمام دیوان مرزا منظر جان جاناں کا کہا ہوا ہے۔

مرزا منظر کے حالات جس کتاب میں چاہو اٹھا کر دیکھ لو یہی پاؤ گے کہ انھوں نے اردو میں شعر کہنا ترک کر دیا تھا اور صرف فارسی میں شعر کہتے تھے۔ شاید اس کی وجہ یہ معلوم تھی کہ جب یقین کے کلام کی شہرت ہوئی اور شاگرد کے کلام سے استاد کا کلام دبنے لگا تو عبدالحی تاباں نے جو مرزا منظر کے بہت منہ چڑھے ہوئے تھے،

اے مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ میں نے یہ واقعہ کسی کتاب میں پڑھا تھا۔ کہ یقین کے شہرت کلام کی وجہ سے تاباں نے مرزا منظر کو رنجیتہ گوئی سے منع کر دیا۔ میری سہل انگاری تھی کہ اس واقعہ کا نوٹ کرنا بھول گیا اس کے بعد حافظہ برزور ڈال ڈال کر سکڑوں ہی کتابیں الٹ ڈالیں پھر بھی پتہ نہ چلا۔ لاچار اس واقعہ کو ”شاید“ کا تاج پینا کر صرف رائے کی صورت میں لکھتا ہوں۔ ۱۵ میر عبدالحی تاباں علوی سید اور دہلی کے رہنے والے تھے۔ ظاہری حسن و جمال کے ساتھ طبیعت بھی لاجواب لے کر آئے تھے شاعری سے خداداد مناسبت تھی۔ پہلے محمد علی حسرت کے شاگرد ہوئے لیکن تھوڑے ہی دنوں میں استاد سے بڑھ گئے۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس کے بعد اپنا کلام شاہ حاتم کو بھی دکھایا۔ اس شاگردی کا اعتراف انھوں نے کئی جگہ اپنے کلام میں کیا ہے۔ ان کو شراب کی ایسی لت پڑی کہ جوانی ہی میں ان کا خاتمہ ہو گیا۔ ان کا کلام دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ زبان ایسی لطیف اور روانی اس غضب کی ہے کہ تعریف نہیں ہو سکتی۔ میرے پاس ان کے دیوان کا نسخہ موجود ہے اگر فرصت نے موقع اور دل دماغ نے کام دیا تو کسی نہ کسی دن ان کا دیوان بھی مرتب کر کے شائع کروں گا۔

ان کو اردو میں شعر کہنے سے منع کیا۔ اور مرزا صاحب نے بھی اس کو تسلیم کر کے  
 ”ریختہ گوئی“ ترک کر دی۔ مرزا صاحب کا جو تھوڑا بہت کلام پہلے کا تھا وہ رہ گیا  
 اور اس کو تبرک کی طرح لوگ اب آنکھوں سے لگاتے ہیں۔ اس واقعہ کو مصحفی نے یوں  
 لکھا ہے کہ :

”چوں دریاں روز ہا میر عبدالحی تا باں دوستی بشت تمام داشت چند غزلیات متعددہ  
 از عامہ فکرا ایشاں (مرزا منظر) بر صفحہ کاغذ ریختہ بودند مشارک الیہ مانع آمد۔ آخر  
 ایشاں قرار شعر گفتن خود بزبان فارسی دادند و بعد ازیں بر ریختہ زبان تیا لودند۔  
 گر ہماں قدر کہ با صلح دوسہ شاگرداں بکار آید“

اس کے بعد یہ کہا جاسکتا ہے کہ شاعر اپنے جوش کو روک نہیں سکتا۔ اس لئے وہ خود  
 غزلیں لکھتے تھے اور یقین کا نام ڈال دیتے تھے۔ اس کا جواب بالکل صاف ہے۔  
 اگر مرزا صاحب کا جوش شاعری کسی طرح نہیں رک سکتا تھا تو یقین کے مرنے کے  
 بعد وہ کیوں یکایک غائب ہو گیا۔ یقین کا انتقال ۱۱۶۹ھ میں ہوا اور مرزا صاحب  
 ۱۱۹۵ھ میں شہید ہوئے۔ پھر آخر ۲۶ سال تک یہ جوش ریختہ گوئی کہاں چلا گیا۔  
 لیوں کہ یقین کے علاوہ ان کے اور کسی شاگرد کے متعلق نہیں کہا جاتا کہ اس کو  
 مرزا صاحب خود شعر لکھ کر دیا کرتے تھے۔

اس کے بعد خود ان دونوں کے کلام پر نظر ڈالی جائے۔ کیا کوئی کہنے کی جرأت  
 دے سکتا ہے کہ دونوں کلام ایک ہی شخص کے ہیں۔ میر صاحب اتنے بڑے شاعر سخن سنج

و سخن فہم ہو کر یہ کہنے کی جرأت نہ کر کے کہ میں نے دونوں کا کلام دیکھا، مجھے ان دونوں میں کوئی فرق نہیں معلوم ہوتا۔ حسن یا کوئی دوسرے تذکرہ نویس اس پہلو سے اس واقعہ کی تائید میں کوئی رائے ظاہر کرتے تو مجھے کچھ لکھنے کی ضرورت ہوتی۔ ان کا اس واقعہ پر اس پہلو سے نظر نہ ڈالنا گو ثبوت قطعی نہ ہو مگر رجحان ضرور پیدا کرتا ہے کہ وہ کلام کی بنا پر یہ الزام ثابت نہیں کر سکتے۔ یقین کا دیوان اب چھپ رہا ہے۔ مرزا صاحب کا کلام ہر تذکرے میں موجود ہے، آپ خود ملا کر دیکھ لیجئے۔

مرزا صاحب کے ہاں متانت ہی تو یقین کے ہاں شوخی۔ ان کے ہاں بڑھوں کی سی باتیں ہیں تو ان کے ہاں جوانی کا جوش۔ ان کے ہاں لفظوں کی بہتات ہے تو ان کے ہاں قلبی کیفیات کا اظہار۔ ان کے ہاں حقیقت کا رخ ہی تو ان کے ہاں مجاز کا پہلو۔ غرض دونوں کے کلام میں زمین آسمان کا فرق ہے۔

اس بحث پر میں ایک خاص پہلو سے بھی نظر ڈالنا مناسب سمجھتا ہوں۔ قاعدے کی بات ہے کہ جس خاص مضمون سے کسی شاعر کو شوق ہوتا ہے وہ طرح طرح سے اس کو اپنے اشعار میں لاتا ہے۔ یقین کو شیریں و فرہاد کے قصے سے کچھ خاص دلچسپی تھی (شاید اس لئے ہو کہ وہ فرہاد کی طرح مارے جانے والے تھے) اور انھوں نے

اتنے چھوٹے سے دیوان میں ۳۸ جگہ اس قصہ کو تلمیحات سے پہلوؤں سے بانڈھا ہے۔ اگر واقعی مرزا صاحب ہی نے یقین کا دیوان کہا ہے تو کہیں ایک جگہ تو وہ اپنے کلام میں بھی اس قصے کو لاتے۔ ان کے سارے کلام میں ایک جگہ بھی شیریں و فرہاد کا

ذکر نہیں آیا ہے۔ میں نے مرزا صاحب کا فارسی دیوان بھی دیکھا، اس میں اس قصے کے لوگوں کے نام صرف ۹ جگہ آتے ہیں اور وہ بھی اکثر استعارتاً۔ دو ایک نمونے

ملاحظہ ہوں:

(منظر)

دید چوں خوش کا یم در کندن جاں کو بہن  
از زبان تیشہ کرد اقرار استادی مرا  
بگو ہستاں بنال و گوش کن ز درد محرومی  
روان کو بہن تا حال در کہسار می نالد  
ہر کجا من نگرم جوئے روانی در کوہ  
سر بسنگ زخم و ماتم فسہاد کنم  
مرزا منظر کا ایک ہی شعر ایسا ہی جو یقین کے ایک شعر سے بالکل ملتا جلتا ہے۔  
ان دونوں شعروں کو ملا کر پڑھنے سے میرے بیان کی تائید ہو جائیگی کہ دونوں  
شاعروں کا طرزِ ادا کس قدر مختلف ہے۔

مرزا منظر فرماتے ہیں

می توان اوصاف کرد آخر کہ اول چون کیست  
در ہلاک کو بہن پر ویز بے تقصیر بود

دیکھئے یقین اس مضمون کو کس شوخی سے ادا کرتے ہیں

مارے ہی جاتے ہیں آخر کو بہن سے سر چہ  
خسرو بے چارہ اور شیریں بچاری کیا کرے

کیا کوئی کہہ سکتا ہے کہ یہ دونوں شعر ایک ہی شاعر کے دماغ سے نکلے ہیں۔

ایک منطق لے کر بیٹھے ہیں، دوسرے نے محض دنیا کا رنگ دکھ کر کہہ دیا کہ ایسے لوگ

جو تیاں ہی کھاتے ہیں بھلا کسی دوسرے کا اس میں کیا قصور۔

مجھے اس بات کے تسلیم کرنے میں زرا بھی تامل نہیں ہو سکتا کہ مرزا صاحب نے

یقین کو اصلاح دینے میں خاص توجہ کی ہے اور یہی خیال اکثر و بیشتر تذکرہ نویسوں کا ہے۔ مجھے مرزا صاحب کے اکثر شاگردوں کے دیوان دیکھنے کا اتفاق ہوا ہے۔ شاید ہی کوئی شاگرد ہوگا جس نے اپنے دیوان میں استاد کی تعریف نہ کی ہو۔ خواجہ احسن اللہ بیان لکھتے ہیں ۵

بندہ سے ثنا حضرت استاد کی کیا ہو  
منظرِ خداوند کی وہ ذاتِ اتم کا  
محمد باقر خیز کہتے ہیں ۵

لے خیز شکر کہ ہے مصحفِ اربابِ جنوں  
فیض سے حضرت منظر کے یہ دیوان میرا  
محمد فقیہ وردمند لکھتے ہیں ۵

۱۔ خواجہ احسن اللہ بیان۔ اکبر آباد کے رہنے والے تھے۔ دہلی میں آرہے تھے۔ مرزا منظر کے شاگرد ہوئے اور تھوڑے ہی عرصہ میں صاحبِ دیوان ہو گئے۔ دہلی سے نکل حیدرآباد چلے گئے اور وہیں ان کا انتقال ہوا۔ ان کا دیوان میں نے دیکھا ہے۔ اکثر غزلیں ۵۔ ۵ شعروں کی ہیں ان کا رنگ یقین کے رنگ سے بہت ملتا ہے مگر یقین کی سی شوخی نہیں ہے ۳۵ محمد باقر خیز دہلوی۔ مرزا منظر کے شاگرد تھے۔ جب دہلی پر تباہی آئی تو یہ عظیم آباد چلے گئے اور نواب سعید احمد خاں صولت جنگ کی مصاحبت میں اچھی طرح زندگی گزار گئے۔ بہت ہمیدہ اور بابر باش آدمی تھے صاحبِ دیوان ہیں۔ ۳۵ محمد فقیہ وردمند اود گسر (دکن) کے رہنے والے تھے۔ ۳۶ اللہ احسن باپ کے ساتھ دہلی آئے۔ یہاں ان کے والد کا انتقال ہو گیا۔ مرزا منظر نے ان کو پالا۔ جب زراہوش سن بھالا تو مرزا صاحب کے مرید اور شاگرد ہو گئے۔ دہلی سے یکایک دل لیا اچاٹ ہوا کہ یہاں سے نکل سیدھے عظیم آباد پہنچے اور وہاں نواب غلام حسین خاں اور نواب عظیم خاں کے ملازم ہو گئے۔ وہاں بھی دل نہ لگا تو پھر دہلی آئے یہاں کی تباہی سے پریشان ہو کر مرشد آباد گئے اور وہیں ۳۶ اللہ احسن میں انتقال کیا۔ فن سخن میں استاد اور طریقہ مصاحبت میں ماہر تھے۔ ان کا فارسی دیوان اور ساقی نامہ بہت مشہور ہے۔

خدیو سخن میرزا جانِ جان کہ حکم اس کا ہی ناطقہ پر رواں  
 لقب اس کا ہی ذوالجلال سخن کہ بندے ہیں اس کے سب اباب فن  
 کوئی آج اس کے برابر نہیں وہ سب کچھ ہے الا پیر نہیں  
 اور انعام اللہ خاں یقین نے تو جایجا استاد کی تعریف کی ہے۔ مرزا منظر کو اپنے  
 شاگرد سے جو انس تھا اس کے لئے ان کا کلام دیکھو۔ جو ہر قابل کی قدر کرتے تھے  
 دردمند کے متعلق فرماتے ہیں ۵

منظر مباحث غافل از احوالِ دردمند بعلتِ ستِ این کہ در گره روزگار نیست  
 جب دردمند کے حال پر مرزا صاحب کی یہ نظر عنایت تھی تو انعام اللہ خاں  
 یقین کے لئے توجہ کچھ بھی کرتے وہ کم تھا۔ مرزا صاحب چار بزرگوں سے بیعت  
 ہوئے (۱) نور محمد بدایونی (۲) حاجی محمد افضل (۳) حافظ سعد اللہ۔  
 (۴) محمد عابد۔ ان چاروں بزرگوں کا سلسلہ ایک ہی واسطہ سے یقین کے  
 دادا سے جا ملتا ہے۔ پہلے تین بزرگوں کا سلسلہ تو شیخ محمد معصوم تک پہنچتا ہے اور  
 چوتھے بزرگ کا شیخ عبدالاحد سے یہ تو میں پہلے ہی لکھ چکا ہوں کہ شیخ محمد معصوم  
 اور شیخ عبدالاحد سگے بھائی تھے۔ اس کے علاوہ ایک یہ بھی تعلق تھا کہ شیخ عبدالاحد نے  
 اپنے بھائی شیخ محمد معصوم سے بیعت کر لی تھی۔ مرزا منظر کا نام ان کی شاعری سے  
 نہیں ہے۔ ان کی بزرگی و تقدس سے ہے۔ اس لئے ان تعلقات کو پیش نظر رکھ کر  
 اگر یہ نتیجہ نکالا جائے کہ مرزا صاحب نے یقین کی تربیت کی طرف خاص توجہ

کی تھی تو وہ ہر طرح قابل قبول ہے۔ یہ سب جانتے ہیں کہ ہمارے نوجوان شاعر بڑھاپے کے مضامین اور بڑھے شاعر جوانی کے مضمون بانڈھتے ہیں مگر باوجود اس کے میں تو یہاں تک ماننے کو تیار ہوں کہ اصلاح کے وقت خود مرزا صاحب نے بعض شعر ممکن ہی اپنی طرف سے بڑھا دیئے ہوں اور ایسا اکثر ہوتا ہے۔ میں ان اشعار کو نیچے دیتا ہوں جن کے متعلق شبہ کیا جاسکتا ہے کہ یہ کسی بڑھے کہنہ مشوق اور متین شخص کے کہے ہوئے ہیں اور ان میں وہ شوخی اور تہل نہیں ہے جس سے یقین کا سارا دیوان بھرا پڑا ہے۔

- ۱۔ مجھتا قدر میرے ضعفِ پیری کی جن جہتے جو تجھ سا کوئی تیرے تیرے قد کو کہاں کرتا
- ۲۔ عشق کو ایامِ پیری میں یقین موقوف رکھ
- ۳۔ ناتوانی سے اسے جور و جفا کی تاب نہیں
- ۴۔ چھوڑا عشق نہیں مچھکو تو یا نذرِ سحر
- ۵۔ بڑھاپے میں یقین کے جامِ مے سے دیکھو کہ

بس تمام دیوان میں اسی قدر شعر ہیں جن سے یہ شبہ ہو سکتا ہے کہ یہ کسی بیس کھپس برس کے نوجوان شخص کی قلم سے شاید نہ نکلے ہوں اور ان میں وہ جوش اور رنگ بھی نہیں ہے جس سے یقین کا دیوان رنگا ہوا ہے۔ اس لئے ان کے متعلق یہ خیال پیدا ہو سکتا ہے کہ مرزا منظر نے اصلاحِ غزل کے وقت یا تو ان کو بڑھا دیا ہے یا یقین کے اشعار کے الفاظ تبدیل کر کے ان کو یہ شکل دیدی ہے۔ اس کے مقابل میں وہ شعر دیکھو جو یقین نے استاد کی تعریف میں کہے ہیں کیا توقع کی جاسکتی ہے کہ کوئی استاد ایسا



بے حیثیت ہوگا کہ خود اپنی تعریف کر کے شاگرد کے دیوان میں اس کو داخل کرے۔  
مرزا منظر کی عالی ظرفی سے تذکرے بھرے پڑے ہیں اور ان کا شمار اولیا و کبار میں  
ہوتا ہے، ان کے متعلق تو یہ قیاس بھی نہیں ہو سکتا کہ انہوں نے اپنی تعریف میں یہ  
اشعار کہے ہونگے۔ اب وہ اشعار ملاحظہ ہوں ۵

- ۱۔ جوں نماز اپنے پہ صبح و شام لازم کرتی تھی  
حضرت استاد یعنی شاہ منظر کی ثنا
- ۲۔ مجھ سے پھر کو کیا ہی جوں نگں حرف آشنا  
کون بچانے یقین بن حضرت منظر کی قدر
- ۳۔ سایہ بے شخص ٹھیرتا نہیں، کتابی یقین  
آپ سے مجھ کو جدا حضرت منظر نہ کرو
- ۴۔ شعر خاطر خواہ مجھ سے ہو نہیں سکتا یقین  
جب ہوا استاد ناقص پر کامل کیا کرے
- ۵۔ یقین کی گفتگو کے لطف کو بات نہ کہی کوئی  
بغیر حضرت استاد مرزا جان جان سمجھے

کیا خود شاعر کے علاوہ کوئی دوسرا شخص شعر نمبر ۳ کہہ کر اس کے دیوان میں شریک کر سکتا ہے  
اور اگر داخل کرنا بھی چاہے تو کیا وہ شاعر اس کا روادار ہو سکتا ہے اور کیا شعر نمبر ۴ میں بعلیٰ  
وہ خود استاد اپنے متعلق لکھ کر شاگرد کے شعروں میں شریک کرنا گوارا کر سکتا ہے! اگر ان  
شعروں کو کوئی یہ کہدے کہ مرزا منظر کے ہو سکے ہیں تو پھر اس کو اختیار ہے کہ یہ بھی کہدے  
کہ یقین کا سارا دیوان مرزا صاحب کا کہا ہوا ہے کیوں کہ ان اشعار میں یقین کا رنگ موجود ہے۔  
دیوان یقین | یقین کے دیوان حیدرآباد میں تو اکثر جگہ ہیں لیکن شمالی ہند میں زرا کم ملتے ہیں  
وہاں جو کچھ تھوڑے بہت نسخے تھے وہ یورپ کے کتب خانوں میں پہنچ گئے۔ اب کہیں  
ہندوستان کے بڑے بڑے کتب خانوں میں ایک آدھ نسخہ رہ گیا ہو تو رہ گیا ہو یقین کے

مرنے کے بعد ہی جو نسخہ اورنگ آباد پہنچا اس میں ۱۴۰ غزلیں اور ہر غزل میں ۵ شعر تھے  
 پچھمن نرائین شفیق اورنگ آبادی نے اس دیوان کی غزل پر غزل لکھ کر اپنا دیوان  
 پورا کیا اور آخر میں اشعار کی تعداد کو اس طرح ظاہر کیا ہے

شاہِ ملک سخن ستودہ جناب	نام جس کا یقین نیک صفات
ایک دیوان (ہی) نہیٹ شیریں	جس کی لذت ہی مثل قند و نبات
زیر جتنے یقین کے نام کے ہیں	اتنے ہی ریختے صفا کے ساتھ
یعنی وہ گل ہیں ایک سو ستر	آٹھ سو پچاس ہیں ابیات
اتنے ہی ریختے کہے میں نے	جس قدر میرے پر ہوئے اثبات
گل کتابت پہ دونوں دیوان کی	ایک ہزار اور سات سو اور سات
ختم کر اب یہ گفتگو صاحب	سردیہ انبیا پہ بھیج صلوات
دل نے تاریخ بھی کہی اس کی	صاحب ناقص اور یقین کے نکات

۱۲۲۰ھ

—

میں نے جو یقین کے دیوان کے ۱۲-۱۳ نسخے دیکھ کر اپنا نسخہ مرتب کیا ہے  
 اس میں بھی مل ملا کر زیادہ سے زیادہ (۱۴۰) غزلیں پانچ پانچ شعر کی ہوئی ہیں  
 یقین کی طبیعت میں بڑی جدت تھی اول تو ۵-۵ شعروں کی غزلوں کا التزام  
 ایک ہی چیز تھا۔ دوسرے دیوان میں ۱۴۰ غزلیں لکھیں جو اجد کے لحاظ سے

۱۵ یہ ریختے میں صاحب تخلص کرتے تھے ۱۲

ان کے تخلص کے حروف کے برابر ہیں۔ ان کے اس رنگ نے یہاں تک زور پکڑا کہ دہلی تو دہلی، دکن میں بھی پانچ پانچ شعر کی غزلوں کا طریقہ پڑ گیا اور بہت دنوں تک قائم رہا۔

میں نے اپنے مرتبہ دیوان کی غزلوں کا مقابلہ صاحب کے دیوان سے کیا جس میں یقین کی غزل پر غزل لکھنے کا التزام رکھا گیا ہے، تو اپنے نسخہ میں دو غزلیں ایسی پائیں جن کا جواب صاحب کے یہاں نہیں ہے۔ ایک کا مطلع یہ ہے:

ہر ترے داغ سے تر سینہ سوزاں میرا  
آب رنگ آگ سے رکھتا ہے گلستاں میرا

اور دوسرے کا مطلع یہ ہے:

پھر کوئی سلسلہ جنباں ہوا زردان کے بیچ  
آج زنجیر سے آتی ہے جہنگ کان کے بیچ

اس کے مقابل میں صاحب نے یقین کے دیوان پر جو اپنا دیوان لکھا ہے اس میں ایک غزل ہے جس کا جواب میرے مرتبہ دیوان یقین کے نسخہ میں نہیں ہے صاحب کی وہ غزل پوری لکھے دیتا ہوں:

آ کے مجلس میں ہم نے کام کئے	چشم ساقی سے جام وام کئے
بسکہ کم طرف تھے تنگ میں چھکے	دو پیالوں میں دھوم دھام کئے
ریختوں کا یقین کے بارے جواب	شکر حق ہم نے انصرام کئے
ہم غلام علی کے ہو کے غلام	سر آزاد کو غلام کئے
ریختہ کی زباں کے صاحب ہو	فارسی میں شفیق نام کئے

اس غزل کو گن بھی لیا جائے تو صاحب کی گل ۱۶۹ غزلیں ہوتی ہیں معلوم ہوتا ہے کہ یقین کی اس غزل کا جواب جس کی ردیف میرا اور قافیہ سوزان و گلستاں وغیرہ اور جس کے اکثر اشعار تذکروں میں ملتے ہیں ان کے دیوان کے اس نسخے میں نقل ہونے سے رہ گئی ہے جو حیدرآباد کے کتب خانہ آصفیہ میں ہے۔ یقین کی ایک غزل ایسی ہی جس کے بعض اشعار کے متعلق کہا جاسکتا ہے کہ وہ جیسے ویسے شیخ شرف الدین مضمون کے ہاں موجود ہیں شفیق بھی تسلیم کرتے ہیں کہ اس غزل میں یقین کا روزمرہ نہیں ہے۔ اس لئے یہ شعر مضمون ہی کے ہونگے جو غلطی سے یقین کے دیوان میں لکھ دیئے گئے۔ میر صاحب نے بھی اس غزل کو مضمون ہی

کی لکھا ہے۔ غزل یہ ہے۔

چلا آنکھوں سے جستہ جستہ میں وہ محبوب عجب تھا ہے  
 کبھو آنکھیں بھراتی ہیں کبھو دل ڈوب جاتا ہے  
 میری رائے بھی یہی ہے کہ یہ غزل مضمون کی ہے اور غلطی سے یقین کے ہاں لکھی گئی ہے۔ کیوں کہ احسن اللہ بیان نے جو مرزا مظہر کے شاگرد تھے اپنی ایک غزل میں اس طرف اشارہ کیا ہے وہ لکھتے ہیں۔

بیاں جب میں بیان کرتا ہوں مضمون مضمون کا  
 کبھو آنکھیں بھراتی ہیں کبھی دل ڈوب جاتا ہے  
 چوں کہ یہ غزل تقریباً ان تمام نسخوں میں تھی جو میری نظر سے گزرے اور صاحب بھی اس کے جواب میں غزل لکھی ہے۔ اس لئے میں نے اس کو یقین کے دیوان میں جگہ دیدی اور نہ میری رائے میں یقیناً یہ غزل یقین کی نہیں ہے۔ اس کے علاوہ ایک اور

غزل ہے جس کے بعض اشعار کے متعلق کہا جاسکتا ہے کہ یقین کے نہیں ہیں۔ اس غزل کا مطلع ہے

پھر کوئی سلسلہ جنباں ہوا زندان کے بیچ آج زنجیر سے آتی ہے جہنگ کان کے بیچ  
میرا خیال ہے کہ یہ طرحی غزل تھی اور غلطی سے کرم اللہ خاں درد کے بعض  
اشعار یقین کے ہاں کاتب نے لکھ دیئے ہیں اور یہ بھی ممکن ہے کہ یہ غزل یقین کی نہ ہو  
کیوں کہ نہ تو اس کا جواب شیفتق نے اپنے ہاں دیا ہے اور نہ یہ غزل سوا ایک نسخے کے  
جو سب سے پرانا ہے اور کسی دوسرے نسخے میں ہے۔ اور جس نسخہ میں یہ غزل  
درج ہے اس میں بھی حاشیہ پر لکھی ہوئی ہے۔ کرم اللہ خاں درد کی پوری غزل  
لکھ دیتا ہوں مقابلہ سے معلوم ہو جائے گا کہ کون کون سے اشعار مشترک ہیں۔

عشق کی آگ لگی ہے میرے اب جان کے بیچ  
میں روانہ ہوں ترا جھکونہ مارے ظالم  
عقل اور ہوش گیا دیکھ کے غم کے کی فوج  
یہ دوا نکھیں مہین دریا سستی لیتی ہیں خراج  
سامنے ہوتے ہی پھر نعش نہ پائی دل کی

شمع سا جل کے بھجوں گا ابھی ایک آن کے بیچ  
قتل محبوں کا پڑھا ہے کہیں قرآن کے بیچ  
ایک دل اڑ کے رہا عشق کے میدان کے بیچ  
اب تم بھی نہیں ان دیدہ گریبان کے بیچ  
بٹ گیا نوکِ سناں پر صفِ مرگان کے بیچ

زخمِ دل مومنے دے ناسور نہ کر اس کا علاج  
ورد میں جو کہ فراہی نہیں دے رمان کے بیچ

۱۔ کرم اللہ خاں درد۔ نواب عمدۃ الملک امیر خاں کے بھانجے اور بڑے خوش فکر شاعر اور یقین کے ہمعصر تھے

اسی طرح میں حسمت اور فغان کی بھی غزلیں ہیں۔ حسمت کے مطلع کا ایک مصرعہ یقین کے مطلع کے ایک مصرعہ سے ملتا ہے۔ مگر دونوں مطلعوں میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ نکمت گل نے جگایا کسے زندان کے بیچ پھیر زنجیر کی جھنکار پڑی کان کے بیچ میرے کرم فرما عمر با فعی صاحب نے جھکو یقین کے دیوان کا ایک نسخہ مولوی بسمل سے لا کر دیا تھا۔ اس میں ایک غزل ایسی ملی جو نہ تو کسی اور نسخے میں ہے اور نہ وہ یقین کا روزمرہ ہے، پر نے زمانہ کے کسی معمولی شاعر کا کلام ہے۔ لطف یہ ہے کہ یہ غزل میں نے کبھی ایک بیاض میں دو شعر شاعر کے نام سے دیکھی ہے۔ حافظہ پر زور ڈالا، سیکڑوں بیاضوں کو چھان مارا لیکن پتا نہیں چلا۔ لیکن باوجود اس کے نہ تو میں اپنے حافظہ کو غلط کہہ سکتا ہوں اور نہ اس غزل کو یقین کے دیوان میں جگہ دینے کے لئے تیار ہوں۔ یقین کا دیوان آپ کے سامنے ہے، غزل پوری کی پوری یہاں نقل کئے دیتا ہوں، آپ خود فیصلہ کر لیجئے کہ ایسی پھر غزل اس دیوان میں

۱۔ میر مختتم علی خاں حسمت خلف میر باقی ان کا آبائی وطن ہر خشاں تھا۔ یہ دہلی میں پیدا ہوئے۔ مغلیہ دور میں رہتے تھے صحیح النسب سید اور سپاہی پیشہ آدمی تھے ۱۱۶۳ھ میں یکایک انتقال کیا۔ ۱۱۷۵ھ شرف علی خاں فغان احمد شاہ بادشاہ کے کوکہ اور امرے دہلی میں سے تھے پہلے دہلی چھوڑ مرشد آباد گئے اور واپس آگئے۔ اس کے بعد پٹنہ چلے گئے اور راجہ شتاب رائے کے ندیم خاص ہو گئے۔ آخر ۱۱۹۶ھ میں (سناخ نے نہ انتقال ۱۱۸۶ھ لکھا ہے) انتقال کیا۔ میر تقی میر کا ان سے بڑا دوستانہ تھا۔ یہ اس قدر با مذاق آدمی تھے کہ ان کو ظریف الملک کا خطاب دیا گیا تھا ۱۲

جگہ پاسکتی ہی یا نہیں ۷

ہمارے عیش کی مجلس برہ کی آگ جلا ہی  
 نہ گلشن ہی نہ موہن ہی نہ مطرب ہی نہ پیلا ہی  
 ہمیں ہیں عشق کے جوگی ہمارے شوق مٹی میں  
 نہ نیشک ہی نہ پوتھی ہی نہ سمن ہی نہ مالا ہی  
 گہانے کو رقیبوں کے خدنگ آہ بن میرے  
 نہ نیزہ ہی نہ تلیم ہی نہ بدھمی ہی نہ بھالا ہی  
 ترے رخ - زلف خط انجھیاں کی خوبی کا چمڑا  
 نہ سنبل ہی نہ ریحان ہی نہ نرگس ہی نہ لالا ہی  
 یقین کی بے قراری اور فغاں سے آج آسودہ

نہ دریا ہی نہ باراں ہی نہ ندی ہی نہ نالا ہی

میرے خیال میں یہ فغاں کی غزل ہی اور اس کا مقطع یوں ہی ہے

یقین ہی بقراری سے فغان کی آج آسودہ نہ دریا ہی نہ باراں ہی نہ ندی ہی نہ نالا ہی

واللہ اعلم بالصواب

مجھے کریم الدین کے تذکرہ طبعات الشعرا میں یہ دیکھا کہ بڑا تعجب ہوا کہ وہ نواب  
 مصطفیٰ خاں شیفتہ کے حوالے سے یقین کے دو دیوانوں کا ہونا بیان کرتے ہیں  
 درآں حالیکہ گلشن بنجار میں شیفتہ نے صرف ایک دیوان کا ذکر کیا ہے۔ اس سے  
 زیادہ پریشان مجھ کو گارساں دی تاسی کے ایک اور بیان نے کر دیا۔ وہ لکھتے ہیں کہ  
 ”بہی نراین نے یقین کی بہت سی رباعیاں، مطلعے، غزلیں اور فردیات ۸۵

۱۷ بہی نراین جہان۔ ذات کے کھتری دہلی کے رہنے والے اور کہیم نراین رند کے پوتے تھے۔  
 پہلے یہ خاندان ناہو میں رہتا تھا وہاں سے دہلی میں آ بسا۔ پہلے اچھے کھاتے پیتے لوگ تھے۔ یکایک  
 (بقیہ نوٹ برصغیر آئندہ)

دوقوں میں نقل کئے ہیں۔“

بنی نراین کے تذکرے کا نام دیوانِ جہان ہے۔ مجھے حیرت تھی کہ یہ رباعیاں  
مطلوع اور فردیات اس کو کہاں سے مل گئے۔ نہ کسی تذکرے میں ان کا کوئی ذکر ہے  
اور نہ یقین کے دیوان کے کسی قلمی نسخے میں ان کا اندراج ہے۔ دیوانِ جہان کی  
ملاش کی لیکن نہ مل سکا۔ یورپ کے کتب خانوں کی فہرستیں دیکھیں ان میں بھی  
یہی پایا کہ یقین کے دیوان میں صرف غزلیں ہی غزلیں ہیں۔ آخر جب بنی نراین کے  
متعلق ڈاکٹر اسپرنگر کی رائے پڑھی اس وقت چین آیا۔ وہ لکھتے ہیں کہ:  
”بنی نراین نے دیوانِ جہان میں تحقیق سے بالکل کام نہیں لیا ہے اور اس لئے  
اس کے انتخاب پر اعتبار نہ کرنا چاہئے۔“

میری بھی یہی رائے ہے کہ بنی نراین نے محمد حسین یقین اور ہندوستان کے  
تمام یقینوں کا کلام انعام اللہ خاں یقین سے منسوب کر دیا ہے ورنہ ممکن نہ تھا کہ  
اتنے قلمی نسخوں میں کہیں ایک رباعی یا مطلع یا فرد نہ نکلتی۔ یہی غلطی محسن نے اپنے

(بقیہ نوٹ صفحہ گزشتہ) انقلابِ زمانہ نے بالکل مفلس کر دیا اور بنی نراین کو دہلی چھوڑنی پڑی  
پھرتے پھرتے کلکتہ پہنچے۔ مولوی حیدر بخش نے ان کو ٹی روپک کے سامنے پیش کر دیا جو زبانِ اردو  
کے دلدادہ تھے۔ انہی کے کہنے سے بنی نراین نے ۱۸۱۴ء میں تذکرہ شعراءِ اردو لکھ کر اس کا نام  
دیوانِ جہان رکھا۔ اس کے علاوہ قصہ ہمایوں درویش۔ چار گلشن اور تہذیب العاقلین ان سے یادگار ہیں  
یہ آخری کتاب سید شاہ اسماعیل شہید کے ایما سے لکھی گئی ہے۔ بنی نراین بعد میں مسلمان ہو کر شاہ  
صاحب کے پیرو ہو گئے تھے۔



تذکرے میں کھائی ہے کہ کسی اور یقین کے شعر کو انعام اللہ خاں یقین کا لکھ دیا ہے۔  
شعریہ ہے

پڑتا ہی پاؤں اس بیت کافر کے بار بار کیا برہمن کو موہ لیا ہے دکھا کے ہاتھ  
معلوم نہیں کہ یہ شعر ان کے کہاں سے ہاتھ آیا۔

بحر یقین نے اپنے سارے دیوان میں کل ۱۳ بحر استعمال کی ہیں اور سب کی  
سب مشکفہ ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کا کلام عام لوگوں میں بھی بہت مقبول ہوا اور  
بقول دی تاسی "اہل ہند نے ان کو حفظ کر لیا ہے اور اکثر بطور نظریہ پیش کرتے ہیں"  
ان ۱۳ بحر میں سے بھی تین چار بحر یقین کو بہت ہی پسند تھیں چنانچہ اکثر  
غزلیں ان کی انہی بحر میں ہیں۔ ان کی کل ۱۴۰ غزلیں ہیں جس میں سے  
۱۴ غزلیں ہزج مثنیٰ سالم (مفاعیلن مفاعیلن مفاعیلن) میں،  
۳۱ رمل مثنیٰ مقصور (فاعلاتن فاعلاتن فاعلاتن فاعلاتن) میں، ۲۲ رمل مثنیٰ  
مخروف (فاعلاتن فاعلاتن فاعلاتن فاعلاتن) میں، ۱۲ محبت مثنیٰ مخزون مخروف  
(مفاعیلن فاعلاتن مفاعیلن فاعلاتن) میں اور ۱۱ رمل مثنیٰ مخزون مخروف مقطوع  
(فاعلاتن فاعلاتن فاعلاتن فاعلاتن) میں ہیں۔ گویا ۱۴۰ غزلوں میں سے  
۱۴۴ غزلیں صرف ۵ بحر میں ہیں اور باقی ۲۳ غزلیں ۸ بحر میں۔

قافیہ یقین نے اپنے ہاں بہت ہی کم قافیہ استعمال کئے ہیں۔ پانچ پانچ شعروں  
کی ۱۴۰ غزلوں میں مطلقوں کو ملا کر ۱۰۲۰ قافیہ ہونے چاہئے تھے لیکن یقین نے

کچھ کم چارہ سو قافیوں میں سارا دیوان ختم کر دیا ہے۔ ایک ایک قافیہ کو مختلف بحر و اور مختلف ردیفوں کی غزلوں میں مختلف پہلو سے بانڈھا ہے۔ اس کی شاعری کا کمال ہے کہ دیوان پڑھنے سے یہ معلوم ہی نہیں ہوتا کہ یہ قافیہ پہلے بندھ چکا ہے اور یہ تو دیوان بھر میں ایک جگہ بھی نہیں ہے کہ دو جگہ ایک ہی قافیہ سے ایک ہی مضمون ادا کیا ہو۔

یقین کے کلام کے | یقین کے کلام کی شہرت نے کچھ اس قدر ترقی کر لی تھی کہ باوجود متعلق رائیں | حقا ہونے کے میر تقی میر کو لکھنا پڑا کہ :

”یقین شاعرِ ریختہ صاحبِ دیوان از بس کہ اشتہار دار و محتاج بہ تعریف و

توصیف نیست“

دی تاسی نے معلوم نہیں کہ انعام اللہ خاں کے متعلق میر صاحب کی یہ رائے کہاں سے معلوم کی ہے۔ وہ اپنے تذکرے میں لکھتا ہے کہ :

”اس شاعر کی شہرت اگرچہ بہت ہے لیکن جتنا کہا جاتا ہے اتنا نہیں ہے۔“

اس کے بعد ہی پھر میر کے حوالہ سے لکھتا ہے کہ :

”جو اشعار یقین کے نام سے موسوم کئے جاتے ہیں ان سے بہتر یا اعلیٰ اشعار

ہونا دشوار ہے“

اب رہے فتح علی گرویزی تو وہ یقین کے دوست تھے انھوں نے اپنے

تذکرے میں اس کو بہت سراہا ہے۔ لکھتے ہیں :

” شہبازِ خیالِش بصیدِ معنی بلند پروازست وہمائے اندیشہ اش بر تلہ قاف  
سخن بہ پریشانی ممتاز۔ بے اغراقی ریختہ گوئی را بر طاق بلند گزاشته و تخم معنی  
در زمین سخن کاشته و آنچه از طبعش سرزده از فرط شیوع و حسن قبول در تمام  
ہندوستان بر افواہ و اسنہ جاری شدہ“

پیام الدین قائم یقین کو ” صدر نشین بزم شعرائے متاخرین “ کہہ لکھتے ہیں کہ :

” دو مصرع از زبان ہائے عامہ سحر طرازش باین ہمہ لطف و خوبی می تراود  
کہ بجز استماع دل عشاق قطراتِ خوں شدہ از دیدہ فرومی چکد“

یہ کچھن زراہن شفیق اورنگ آبادی تو یقین کے کلام کے عاشق تھے انہوں نے  
تو اس کی تعریف کے وہ پل باندھے ہیں کہ اس کو خدائے سخن بنا دیا ہے۔ لکھتے ہیں کہ :

” انعام اللہ خاں یقین شہنشاہ قلم و سخندانِ دیوسف کنعانِ معانی است

طوطی شکر مقال از گلستانِ ہند بر نحو استہ کہ باں عندلیب ہزار داستان سخن بہ تشابہ

گراہید . . . . . بسیارے از شکر مقالانِ مین خیال پرہ ہم صفیری او برداشتند

آخر پشت دست بزین نارسائی بگراشتند ( یہ میر صاحب پر چوٹ ہی کیونکہ انہی کے

یہ الفاظ دہرائے ہیں ) و اکثر نازک خیالانِ شیریں مقالی بمقابلہ او بر خاستند آخر

از قصور بگوش مالی خود پرداخذند . . . . . آری عندلیب کلکش دم از عصائے

ہمدی عسی می زند و مزاجِ عالیش معانی نازک می گزیند۔ معنی آفرینانِ ایں زمان

از نام تضمین کلاش گرم بازاری می دارند ( یہ سودا کی طرف اشارہ ہے

کیوں کہ انہوں نے یقین کے ایک مصرعہ ”کیا کام کیا دل نے دیوانہ کو کیا کہے“ کو  
تضمین کر کے خمسہ کیا ہے) خوش تماشیاں میں عصر از اصفاے نام نالمیش دست  
بگوش می گزارند ... .. الحاصل یقین کیاے عصر و گمانہ زمانہ است وغیرہ وغیرہ“  
غرض کہاں تک نقل کروں صفحے کے صفحے اسی تعریف میں بھرے پڑے ہیں۔  
قدرت اللہ شوق نے نہایت مختصر اور جامع رائے دی ہے کہ:

”مشق سخن او بپایہ استادی رسیدہ بود قافا اہلش مہلت نداد۔ ہر قدر کہ

دیوانش مرتب ست ہمہ انتخاب از درد خالی نیست“

میر حسن کا بھی یہی خیال ہے کہ:

”اشعارش بسیار مکین و موثراند سخن او خالی از درد مندی نیست“

یہ تو یقین کے معاصرین کی رائے ہوئی۔ بعد کے جو لوگ ہیں انہوں نے بھی  
اس کے کلام کے متعلق نہایت اچھے خیالات ظاہر کئے ہیں۔ اس کو فن شعر میں کامل  
(گلستان بے خزان)۔ تمام قسم کے اشعار میں ماہر و آگاہ کامل (کرم الدین) شاعر  
پرورد بامرہ (وزم سخن و سخن شعراء) اور اس کے کلام کو مرغوب طبع اور اس کے  
اشعار کو جاں خراش دل و جان (گلزارِ بہارِ ہم و گلشن بہار)۔ متین (تذکرہ گلشن گنہار)  
پرنک و باحلاوت (گلشن بے خار) لکھا ہے۔ اور یہ تو یقیناً صحیح ہے کہ زبان کی صفائی  
اور اشعار میں مضمون آفرینی پہلے اس نے پیدا کی ہے۔ مصحفی کا قول ہے کہ:  
”دردورہ ایہام گوہاں اول کسے کہ رنجیہ راستہ و رفتہ گفتریں جوان ست“

دی تاسی کا بھی یہی خیال ہی وہ لکھتا ہے کہ :

” یقین کے اشعار (یا کم سے کم وہ اشعار جو اس کے کہے جاتے ہیں) بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں اور پڑھنے میں بڑے بامزہ ہیں : ... پُرانے زمانے کے رنجتہ گویوں میں یقین ہی پہلا شخص ہی جو ہمیشہ اپنے خیالات کو نہایت پاکیزگی اور صفائی سے بانڈھتا ہے جو لوگ اس کے بعد ہوئے ہیں انہوں نے اس بارے میں اس کا نتیجہ کیا ہے“

مولانا عبدالحق تو اپنے تذکرہ گلِ رعنا میں یہاں تک کہ گئے ہیں کہ :

” اگر یقین جیتے رہتے تو میر ہوں یا مرزا کسی کا چہرہ رخ ان کے سامنے نہیں جل سکتا تھا“

یقین کی شہرت خود اس کی زندگی میں اس قدر ہو گئی تھی کہ میر و مرزا کو بھی لوگ خاطر میں نہیں لاتے تھے۔ چنانچہ اسی زمانے کی ایک رباعی ہے :

جس طرح سے لاتے ہیں صنایعِ مستین      اشعار میں رنجتہ کے سودا و یقین  
ایسا کوئی نہیں ہند میں ہر چند کہ ہیں      سجاد و کلیم و میر و درد و تکلیف

۱۔ میر محمد سجاد۔ اکبر آباد کے رہنے والے تھے۔ دہلی میں آکر رہے۔ آبرو کے شاگرد ہوئے۔ ان کے مکان پر عرصہ ہوتا تھا۔ میر تقی میر ان سے بھی بگڑے ہوئے ہیں۔ ان کا کلام بہت شیریں اور دلنریب ہے۔ اپنے زمانہ میں بڑے پارے کے شاعر سمجھے جاتے تھے۔ ۲۔ میاں صلاح الدین مکین۔ دہلی کے رہنے والے اور عالم کے معاصر تھے۔ شراب بہت پیتے تھے اور نہایت شوخ طبع آدمی تھے۔ ان سے بھی میر تقی میر بہت ناراض ہیں۔ فرماتے ہیں ”جو اپنے بے یقینے نہ تمکن۔ باصطلاح یا ان شوخ طبع مرد سیت“ صرف یقین ہی پر میر صاحب کی نظر عنایت نہ تھی بلکہ اس زمانہ میں جو شاعر ان کے مقابل میں آیا۔ انہوں نے اپنے تذکرہ میں اس کی مذمت کر دی ہے۔

پچھن نرائین شفیق کچھ اس سے بھی آگے بڑھ گئے ہیں اور اس رباعی پر حاتم

چڑھاتے ہیں ۵

اگر نہ ہزار برس تک یہ میرزا سودا کرے جو فکر متبع یقین کا از دل و جاں  
کہیگا معنی باریک و خوب شیریں تر و لے نزاکت یہ لطف و یہ قبول کہاں  
ہوتے ہوتے یہ ہوا کہ اگر میر صاحب نے یہ کہا کہ ۵

سارے عالم پر یوں میں چھایا ہوا مستند ہی میرا فرمایا ہوا

تو یقین نے اس کے مقابلے میں خم ٹھونک کر یہ جواب دیا کہ ۵

یقین تائید حق سے شعر کے میدان کا رستم ہے مقابل آج اس کے کون آسکتا ہے کیا قدرت  
یقین کے دیوان کا مقابلہ اس زمانہ کے دوسرے شاعروں سے کرنے کے بعد

یہ ضرور معلوم ہوتا ہے کہ بڑے بڑے شاعر بھی اس کی طرز کی پیروی کرتے تھے۔ اس کی  
بحرں ایسی شگفتہ، اس کے قافیے اور ردیفیں ایسی مرغوب طبع اور اس کے  
الفاظ ایسے سیدھے سادھے اور موثر ہوتے تھے کہ عام تو عام خواص پر بھی اثر  
ڈالے بغیر نہ رہ سکتے تھے۔ اس کا کلام لوگ حفظ کر لیتے اور بطور نظیر پیش کیا  
کرتے تھے، (وی تاسی)

بھلا لوگ یقین کی نقل کریں اور یقین خاموش رہیں۔ ایک ساتھ سب پر

چوٹ کی ہی اور خوب کی ہی لکھتے ہیں ۵

حق کو یقین کے یاروں برباومت و آخر تم نے سخن کی طرزیں اس سے اڑائیاں ہیں

اس زمانے میں شاہ حاتم جگت استاد تھے۔ انھوں نے بلا تامل اپنی پیروی طرز یقین کو نہ صرف تسلیم کر لیا بلکہ اپنے دیوان میں بھی اس کا اظہار کر دیا۔ حاتم نے جو غزلیں یقین کی طرز پر لکھی ہیں وہ حسب ذیل ہیں :-

نمبر شمارہ	مصرعہ اول مطلع غزل حاتم	غزل کہنے کا سنہ
۱	ہماری سیر کو گلشن سے کوئے یار بہتر تھا	۱۱۶۰ھ
۲	جی دیا حاتم نے کیا بے وقت و بے جا بے طرح	۱۱۵۵ھ
۳	ہو رہا ہے ابرا اور کرتا ہے وہ جانا نہ رقص	۱۱۵۸ھ
۴	دیکھ کر بلبل لب و رخسارِ خواہاں کی طرف	۱۱۵۷ھ
۵	سینہ نالوں کا حریف اور چشم گریاں کا حریف	۱۱۶۱ھ
۶	دل میں یوں ہی تجھ خیالِ چشم کے آنے میں دھوم	۱۱۵۳ھ
۷	جب سے تمھاری آنکھیں عالم کو بھائییاں ہیں	۱۱۵۶ھ
۸	خدا کے واسطے کوئی میری فریاد کو پہنچے	۱۱۵۲ھ

اس زمانے میں دہلی تو شاعروں سے بھری پڑی تھی، البتہ شاہ حاتم کے علاوہ صرف چار شاعروں یعنی میر، سودا، درد اور تاباں پر لوگوں کی خاص طور پر نظر پڑتی

۱۷ یہ فہرست مجھے سید محی الدین صاحب قادری - پی - ایچ - ڈی سے ملی ہے۔ جو انھوں نے حاتم کا اصلی دیوان دیکھ کر برٹش میوزیم لندن میں مرتب کی تھی۔ میں ان کی اس عنایت کا شکر گزار ہوں۔ ان غزلوں کے بعض اشعار حاتم کے ”دیوان زادہ“ میں بھی موجود ہیں۔

تھی۔ ان چاروں کے دیوان دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کی بھی بہت سی غزلیں  
 یقین کی طرز پر ہیں لیکن قطعاً طور پر نہیں کہا جاسکتا کہ ابتدا میں اس طرز پر کس نے غزل  
 لکھی۔ اگر یقین کے دعوے کو (تم نے سخن کی طرز میں اس سے اڑائیاں ہیں)  
 تسلیم کیا جائے تو ان طرزوں کا موجود یقین ہی کو مانا جائے گا۔ ان غزلوں کا ایک  
 ایک مصرعہ دیدیتا ہوں، تاکہ یقین کے کلام کے ساتھ ان کو پڑھنے میں لطف آسکے۔

## میر کی غزلیں

مصرعہ

- ۱۔ سب پر روشن ہے کہ شب مجلس میں جب آتی ہے شمع
- ۲۔ آگ سا توجو ہوا اسے گل تر آن کے بیچ
- ۳۔ دور گردوں سے ہوئی کچھ اور مچانے کی طرح
- ۴۔ چمکنا برق کا کرتا ہے کار تیغ ہجر میں
- ۵۔ بہار آئی فراجوں کی سبھی تدبیر کرتے ہیں
- ۶۔ رونے کو کوئی آہوں سے یوں کب تک ہوا دیوے
- ۷۔ بہار آئی نکالومت مجھے اب کے گلستاں سے
- ۸۔ کہو پھر مہر کی وحشت سے ان گلیوں میں آنے کی

## سودا کی غزلیں

- ۱۔ شمع میں ہر چند ہر سر سے گزر جانے کی طرح



- ۲۔ کس کے ہیں زیرِ زمیں دیدہٴ منناک ہنوز
- ۳۔ کیا مچائی اس نے میرے دل کے کاشانے میں دھوم
- ۴۔ ہی زلف میں دل میرا مت کیجیو تو شانہ
- ۵۔ تمیزِ خوب و زشت اے مہرباں کب عشق نے پائی
- ۶۔ نہیں ممکن اسیروں کی کوئی فریاد کو پہنچے۔

### درد کی غزلیں

- ۱۔ گھلا دروازہ میرے دل پہ از بس اور عالم کا
- ۲۔ گر خاک میری سرمہٴ البصار نہ ہووے

### تہا باں کی غزلیں

- ۱۔ صبحِ آغوش میں تھا مہرِ درخشاں میرا
- ۲۔ کس سے پوچھوں ہائے میں دس دل کے سمجھانے کی طرح
- ۳۔ صرف ہی چاک کلاوں میں میری خاک ہنوز
- ۴۔ یاں تلک کی ہی تیرے ہجر میں فریاد کہ بس
- ۵۔ کر نظر تیرے خط و زلف پریشاں کی طرف
- ۶۔ آئی خزاںِ حمن سے گئی اب بہارِ حیف
- ۷۔ نہ کرتی تو معین اس حمن میں گمش جا بلبل
- ۸۔ سن فصلِ گلِ خوشی ہو گلشن میں آئیاں ہیں

۹۔ جی کا دنیا میرے نزدیک تو کچھ دور نہیں

۱۰۔ اے شمعِ رومے گا جو کوئی تیری لگن میں

۱۱۔ گئے نائے ترے یرباد مانندِ جس چپ رہ

۱۲۔ نہیں دیتا ہے وہ ظالم کسی کی داؤ کیا کیجے

۱۳۔ میرے دل کی سی اے یاروں جس فرماؤ کیا جانے

میں نے ان شعرا کی صرف ان غزلوں کا حوالہ دیا ہے جن کے اشعار کے

قافیے یقین کی غزلوں کے قافیوں سے ملتے ہیں۔ اس کے علاوہ بھی حاتم، میر

سودا، درد اور تابان کی بعض غزلیں ہیں جن کی زمین وہی ہے جو یقین کی

غزلوں کی ہے۔ لیکن چون کہ ان میں ایسے قافیے باندھے گئے ہیں جو یقین کے

ہاں نہیں آئے ہیں۔ اس لئے میں نے ان کا حوالہ دینا بے ضرورت سمجھا۔

ممکن ہے کہ بعض اصحاب کے پاس ان شعرا کے دیوان نہ ہوں اور وہ غزلوں

کے مقابلہ کا لطف نہ اٹھا سکیں اس لئے میں ان پانچوں شاعروں کی ایک ایک

غزل یقین کی غزل کے ساتھ یہاں نقل کئے دیتا ہوں اور غزلیں وہی لیتا ہوں

جن کے اکثر اشعار ہم قافیہ میں :

یقین

شاہ حاتم

(۱) پر گئی دل میں تیرے تشریف فرما نے میں دھوم

(۱) دل میں یوں ہے تجھ خیالِ حتم کے آنے میں دھوم

باغ میں محبتی ہے جیسے فصلِ گل آنے میں دھوم

بچ رہی ہو جس طرح مستوں سے منجانے میں دھوم

(۲) تیری آنکھوں نے نشہ میں اس طرح مارا ہے جو  
 ڈالتے ہیں جس طرح بدست میخانے میں دھوم  
 (۳) چاند کے پر تو سے جوں پانی میں ہو جلوہ کا حشر  
 منہ تھے کے عکس نے ڈالی ہے یہاں میں دھوم  
 (۴) ابر جیسے مست کو شورش میں لاوے دل کی تیج  
 مچ گئی ایک بار ان بالوں کے گھل جانے میں دھوم  
 (۵) بوئے مری آتی ہے منہ سے۔ جوں کلی سے بوئے گل  
 کیوں نقین سے جان کرتے ہو مگر جانے میں دھوم

(۲) تم نہ بولو۔ گو کہ عاشق آپ کو ضائع کریں  
 جان من ہوگی تمہارے منہ سے فرما ز میں دھوم  
 (۳) ایک تو فتنہ اٹھاوے ہے تیری خوں کی بو  
 تس اوپر ہوگی قیامت عطر ملوانے میں دھوم  
 (۴) گل گریباں چاک اور غنچے ہوئے ہیں غرق خوں  
 کیا بلا ڈالی ہے تم نے جان پاں کھانے میں دھوم  
 (۵) اس کی ہم سے توجی دینا تجھ اوپر دور نہیں  
 ہو دیگی ہر شہر میں حاتم کے مرجانے میں دھوم

### یقین

(۱) رشک تیری دلربائی کا زبس کھاتی ہے شمع  
 دیکھ تیرے حسن کے شعلہ کو جلجاتی ہے شمع  
 (۲) عاقبت تین پوری ہوتی ہے گردن کا وبال  
 کس قدر پہلے چرب اپنے سے دکھ پاتی ہے شمع  
 (۳) بے حجابی بسکہ شان حسن کے لائق نہیں  
 بزم میں فانوس سے باہر نہیں آتی ہے شمع

### میر تقی میر

(۱) اس کے بچتے بزم میں فانوس میں آتی ہے شمع  
 یعنی اس آتش کے پڑانے سے سڑتی ہے شمع  
 (۲) ہرزماں جاتی ہے گھٹی سامنے تیرے کھڑی  
 جوشِ غم سے آپ ہی اپنے تیس کھاتی ہے شمع  
 (۳) بیٹھے اس مرہ کے کسی کو دیکھتا ہے کب کوئی  
 رنگ و کو بزم میں ہر چند چھمکاتی ہے شمع

(۴) اہل سوز آہن دلوں سے بیکہ شرتے ہیں سخت  
دیکھ کر گلگیر کی صورت کو کٹ جاتی ہے شمع

(۵) باو سے برہم نہیں ہوتا ہے یہ شعلہ یقین  
بلکہ پروانہ کی گستاخی سے جھجلائی ہے شمع

### یقین

(۱) زاہد جو نہ ہم ہوتے یہ دیر تھا ویرانہ

ہر شور سے مستوں کے آباد یہ میخانہ

(۲) منہ اپنے کے گلشن میں رہنے نہ دیا کر تو

یہ سبزہ ترے خط کا ہے سبزہ بیگانہ

(۳) ہوں دور یہ جی میرا راتوں کو تھے گھر پہ

پھر تا ہے پڑا۔ جیسے فانوس یہ پروانہ

(۴) مجنوں نے جو یہ دھوئیں دور ہی میں مچا ہیں

ہر نشہ تو آجائے یہ دشت یہ ویرانہ

(۵) رواد محبت کی مت پوچھ یقین مجھ سے

کچھ خوب نہیں سننا۔ افسوں ہے یہ آسانہ

(۴) باو سے جنبش میں کچھ رہتا نہیں ہے متصل  
اس بہجو کے سے جو کہتی ہے جو جھجلائی ہے شمع

(۵) چھوڑتی ہے لطف کیا افسردگی خاطر کی پیر  
آگے اس کے چہرہ روشن کے بچھ جاتی ہے شمع

### سودا

(۱) ہے زلف میں دل میرا مت کیجیو تو شانہ

زنجیر نہ کھل جائے۔ ہے سخت یہ دیوانہ

(۲) میں تجھ سے یہ کہتا تھا مت گھر سے تو نکلا کر

اب شور قیامت نے گھیرا ہے درخانہ

(۳) اے آتش گل تو ہی کر خس کو میرے اپنا

ہر چند میں گلشن میں ہوں سبزہ بیگانہ

(۴) کعبہ کی زیارت کو اے شیخ میں پہنچو نگا

مستی سے مجھے بھولی جس دن یہ میخانہ

(۵) تنہا نہ ہمارا ہی مضحک ہے تو اے زاہد

گیدی تیری ڈاڑھی پر نہ ہتا ہے سد آسانہ

(۶) در خلق کے میں منہ پر بانڈھا ہے جہاں آسا

تا دم ہے نہ کھولو نگا ہر گز رو کا شانہ

(۷) ہر چیز کہ سب عاشق مضبوط جوانی میں  
اڑتا ہی دھواں جیسے سو داسو ہی پڑوانے

### ورد

### یقین

- ۱۔ کھلا دروازہ میرے دل پہ از بس اور عالم کا
- ۲۔ بلند و پست سب تموار میں اپنی نگاہوں میں
- ۳۔ گلستانِ جہاں کی دیکھو چشمِ عبرت سے
- ۴۔ چمن میں باغباں سے صبح کو کہتی تھی نہیں
- ۵۔ نہیں مذکور شاہاں دروہرگز اپنی مجلس میں
- ۱۔ نہ ہو جو دور میرے سر سے تخلصِ عاطفتِ غم کا
- ۲۔ خداوندی کی چاہی ہو خلافت حق تعالیٰ نے
- ۳۔ ارے واعظ ہمارے پاس ہی آتشِ محبت کی
- ۴۔ سبھی مرتے ہیں خوشنودی پہ جی دیتے ہیں شادی پہ
- ۵۔ شکوہِ حسن سے آنسو ہمارے سوکھ جاتے ہیں
- ۱۔ برابر سازی میں ہوتا ہی جوں سر زیر اور ہم کا
- ۲۔ کہ ہر ایک سر و قد ہی اس چمن میں نخلِ ماتم کا
- ۳۔ گلوں کے منہ پہ یوں چڑھتی ہی دیدہ دیکھیم
- ۴۔ چمن میں باغباں سے صبح کو کہتی تھی نہیں
- ۵۔ نہیں مذکور شاہاں دروہرگز اپنی مجلس میں
- ۱۔ نہ ہو جو دور میرے سر سے تخلصِ عاطفتِ غم کا
- ۲۔ خداوندی کی چاہی ہو خلافت حق تعالیٰ نے
- ۳۔ ارے واعظ ہمارے پاس ہی آتشِ محبت کی
- ۴۔ سبھی مرتے ہیں خوشنودی پہ جی دیتے ہیں شادی پہ
- ۵۔ شکوہِ حسن سے آنسو ہمارے سوکھ جاتے ہیں

### ماباں

### یقین

- ۱۔ میرے جی کی سی اے یاروں جبریں فرما دیا جانے
- ۲۔ ترپ بھی اس طرح کی کشتہ جلا دیا جانے
- ۱۔ ہمیں جس جبرین ہی موت پر صیاد کیا جانے
- ۲۔ جو گزرے سر پہ مقبولوں کو وہ جلا دیا جانے

- ۲۔ تری زلفوں کو دل لینے کے لاکھوں پہنچ آئیں  
 یہ نکلیں صدی کرنے کی کوئی ضیاد کیا جانے
- ۳۔ نگہ آئینہ دل میں تیری جوں ڈوب جاتی ہے  
 لگانا اس صفا سے شہرِ فضا و کیا جانے
- ۴۔ وہ گردن سر کریں میری ہوں کے ایک اشارہ  
 یہ جلدی اور ایسا کب کوئی جلا و کیا جانے
- ۵۔ یقین ہے میرے تیس تاباں کہ جمع نونا لاس  
 یہ انگھیلی سے چلنے کی طرح شمشاد کیا جانے
- ۲۔ دیوانہ ہوں میں جی دینے میں مجنوں کے سلیقہ کا  
 مزے لے لے کے مرنے کی طرح فرما دیا جانے
- ۳۔ ہمیں کانا قفس کا شاخ گل سا جی میں چھتا ہے  
 اسیری کے مزے کو بلبل آزاد کیا جانے
- ۴۔ گلا تو پھٹ گیا نے کی طرح فریاد سے سرا  
 قیامت دوری کس دن ملے گی داؤد کیا جانے
- ۵۔ درختوں سے دے تبتیر اس قدم کو یقین ہرگز  
 یہ انگھیلی سے چلنے کی طرح شمشاد کیا جانے

تاباں نے مقطع میں یقین کے مصرع کی تضمین کی ہے اور پہلے مصرع میں "یقین" کا لفظ لاکر اس طرف اشارہ کر دیا ہے۔ سودا نے بھی یقین کے ایک مصرع کو تضمین کر کے خمسہ کر دیا ہے۔ آخری بند نقل کرتا ہوں۔ معلوم ہوتا ہے کہ سودا اس مصرع کو پڑھتے ہیں

اور مزے لے رہے ہیں۔

مصرع کو یقین تیرے سودا نے سنا تھا کل  
 روتا ہے وہ یوں تیرے بوسے ہی گویا بادل  
 ہے رعد منظرِ نالانِ بجلی کی طرح بے کل  
 پڑھتا ہے یہی پھر پھر آنکھوں کے تیس مل

کیا کام کیا دل نے دیوانہ کو کیا کہئے

تو ہاں میں نے یہ غزلیں تو لکھدی ہیں۔ لیکن یہ ڈر ہے کہ کہیں کوئی صاحب

یہ اعتراض نہ کر بیٹھیں کہ یقین کی تائید میں اس کی تو اچھی اچھی غزلیں لے لیں اور دوسروں کی بری۔ اس کے متعلق میں انتخاب کا اصول پہلے ہی بیان کر چکا ہوں کہ میں وہ غزلیں لوں گا جن میں ہم قافیہ اشعار زیادہ ہوں تاکہ یہ معلوم ہو سکے کہ ان استادوں نے ایک ہی قافیہ کو کیسا چمکایا ہے۔ علاوہ انہیں میں اس بحث کی ابتدا میں ان شعرا کی ان غزلوں کے مطلع دے آیا ہوں جن کا جواب یقین کے ہاں موجود ہے۔ آپ خود مقابلہ کر لیجئے۔ معلوم ہو جائے گا کہ یقین کسی غزل میں بھی ان میں سے کسی استاد سے دب کر نہیں رہا ہے۔

یہ تو ذنگل کا مقابلہ تھا۔ اب دیکھئے اپنے ہی اکھاڑہ کا کیا رنگ ہے۔ مرزا مظہر کے شاگردوں میں یقین کے علاوہ چند ایسے لوگ تھے جو صاحب دیوان ہوئے جنہوں نے استاد کے نام کو چمکایا اور جو آسمان شاعری کے روشن تارے مارے جاتے تھے ان میں احسن اللہ خاں بیان سب سے پیش پیش ہیں۔ یقین کی غزل پر غزل لکھتے ہیں مگر اکثر قافیہ بچا جاتے ہیں۔ ان دونوں کی بھی غزلیں باہم مقابل ملاحظہ ہوں۔ زمین و آسمان کا فرق ہے:

یقین

بیان

۱۔ ناصح سے مجھ کو غم نے کیا تھر تھر حریف  
سوار پھٹ چکا یہ گریباں ہزار حریف

۱۔ آتا ہے مجھ کو دیکھ کے جو شہر بہا حریف  
اے عندلیب تو ہر نفس میں نزار حریف

- ۲۔ بیان تک ہوں خستہ حال کہ دیکھے ہی جو مجھے  
 نکلے ہی اس کے منہ سے بے اختیار حیف
- ۳۔ میں بسکہ خاک میں تھے کوچہ کی مل گیا  
 تس پر بھی تیرے دل میں ہی مجھے عمار حیف
- ۴۔ بسمل ہی کر کے چھوڑ دیا پھر نہ لی خبر  
 فراق سے تیرے نہ بندھایا شکار حیف
- ۵۔ کیا کیا شتر اس کے واسطے میں نے کئے قبول  
 سمجھانہ خیر خواہ بیاں مجھ کو یار حیف
- ۲۔ رویا ہوں یہاں تک کہ آنکھوں میں نم نہیں  
 بے آب ہو گئے گہر آب دار حیف
- ۳۔ کوئی بلبل ان دنوں میں پھسیدو چاہیہاں  
 جب تک کہ چھوٹوں ہو گئی آخر ہمار حیف
- ۴۔ اس دکھ میں دیکھ مرگ بھی مجھ سے سرک گئی  
 کیا غم نے کر دیا مجھے زار و زار حیف
- ۵۔ جاتی نہیں وہ بے مرگی ہجر کی یقیں  
 کچھ وصل کے نشہ نے نہ کھو یا خار حیف

مرزا مظہر کے دوسرے مشہور شاگرد میر محمد باقر حزیں ہیں۔ یہ بھی صاحب دیوان ہیں اور انھوں نے بھی یقیں کی اکثر غزلوں پر غزلیں لکھی ہیں۔ ایک غزل مقابلہ کے لئے لکھا ہوں ۷

- حزیں
- ۱۔ جو ہیں آنکھوں کے مجھ کو ان کو متجانے سو کیا نسبت  
 نگہ کے ہیں جو تشہ ان کو پیمانے سو کیا نسبت
- ۲۔ یہ آہورام تھے مجھوں کے لیے کی خاطر سے  
 و گزیران پر زیادوں کو دیوانے سو کیا نسبت
- یقیں
- ۱۔ تیری آنکھوں کی کیفیت کو متجانے سو کیا نسبت  
 نگہ کی گردشوں کو دور پیمانے سو کیا نسبت
- ۲۔ یہ جو بے ہجر ہیں وہ وصل میں بھی جی نہیں  
 تکلف بر طرف بلبل کو پیمانے سو کیا نسبت



- ۳- خبر لے یا نہ لے صیادان کو دام میں مرنا  
گرفتاروں کو تیرے آب و روانے سے کیا نسبت
- ۴- ہوا ہے تو خیز دیوانہ ان شہری غزالوں کا  
تجھے صحرا سے اب کیا کام ویرانے سے کیا نسبت
- ۳- یہ وہ موتی ہیں جن کی سپیاں آنکھیں ہیں  
میرے آنسو کو مروارید کے دانے سے کیا نسبت
- ۴- ارے دل مت توقع دلبروں سے رکھ ترحم کا  
ہو پیتے ہیں جو شخص ان کو غم کھانے سے کیا نسبت
- ۵- گل اس کا داغ ہے اور سرو اس کا آہ موزوں  
یقین سے نوحہ کر کو باغ میں جانے سے کیا نسبت

مرزا مظہر کے تیسرے مشہور شاگرد محمد نعیم درو مند ہیں۔ وہ مثنوی کے استاد ہیں۔  
ہاں ان کی ایک رباعی اردو کی ایسی ہے کہ یقین کے ایک شعر سے بہت ملتی جلتی ہے۔  
لیکن یقین جو دو مصرعوں میں کہہ گیا۔ وہ ان سے پوری ایک رباعی میں ادا نہ ہو سکا۔  
ایسی ہی باتوں سے شاعر کی استادی معلوم ہوتی ہے۔

### درو مند کی رباعی

کسار میں جا رہا ہے ناحق کے تیسے      پر وزیر سے ابھرا ہے ناحق کے تیسے  
کوئی ٹکڑ پھاڑ سے لیتا ہے      فرہاد کا سر پھر ہے ناحق کے تیسے

### یقین کا شعر

خسرو کے منہ پر چڑھنا اور بیٹوں سے بھڑنا  
کچھ عاشقی نہیں ہے زور آزمایاں ہیں

دیکھتے مضمون ایک ہی ہے مگر جو طریقہ ادا اور شوخی یقین کے ہاں ہے وہ درد مند کے ہاں نہیں۔

اس زمانہ میں ایہام گوئی پر شاعری کا دار و مدار تھا۔ یقین ہی پہلے شخص ہیں جنہوں نے شاعری کو ان اُبھرتوں سے نکالا۔ اور زبان کی صفائی اور مضمون کی پاکیزگی پر شاعری کی بنیاد رکھی۔ چنانچہ مصحفی نے لکھا ہے کہ:

” دردورہ ایہام گویاں اول کسے کہ نہ خیتہ راستہ و رفتہ گفتمائیں جوان لود

بعد از آن تبش بدگیراں رسیدہ “

خود ان کو بھی ایہام گوئی سے نفرت تھی۔ لکھتے ہیں سے  
شاعری ہے لفظ و معنی سے تیری لیکن یقین  
کون سمجھے یہاں تو ہے ایہام مضمون کا تلاش

انقلاب ہمیشہ ایک شخص سے شروع ہوتا ہے۔ اس کے بعد دوسرے اس کی پیروی کرتے ہیں اور اس طرح رفتہ رفتہ تحریک زور پکڑ جاتی ہے۔ یقین کے بعد دوسرے بڑے شعرا نے بھی ایہام گوئی ترک کرنی شروع کی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ تھوڑے ہی عرصہ میں یہ صنعت دہلی کی شاعری سے مفقود ہو گئی۔ غدر سے کچھ پہلے رعایتِ لفظی کا کچھ اثر لکھنؤ سے دہلی پر پڑا تھا۔ مگر وہ تھوڑے ہی دنوں میں زائل ہو گیا۔ اور دہلی کی شاعری نے وہی رنگ اختیار کر لیا جو یقین اور اس کے معاصرین نے ڈالا تھا۔ پہلے زمانہ میں یقین کے جتنے متبع کرنے والے تھے اتنے شاید ہی کسی شاعر کو

نصیب ہوئے ہوں گے۔ بعضوں کا تو یہ حال تھا کہ اس کی غزل پر غزل کہنا باعثِ فخر  
سمجھتے تھے اور اس کے دیوان کے مطالعہ کو اپنی زبان کی اصلاح کا ذریعہ جانتے  
تھے۔ ان سب میں کچھن نرائن شفیق سب سے پیش پیش ہیں۔ ان کا حال میں پہلے  
لکھ آیا ہوں۔ یہ لکھتے ہیں سے  
ہم کو دیوانِ یقین کی سیر ہی صاحبِ سدا بلبلوں سے چھوٹا کب ہی گلستاں کا خیال

دیوانِ یقین خوش خط صاحب نے لکھایا ہے اور اوراقِ طلائی پر کھینچی گئیں تھیں سیریں  
چوں کہ شفیق کی خاص حالت ہے کہ انھوں نے یقین کی ہر غزل پر غزل لکھی ہے  
اس لئے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ دونوں شاعروں کی ایک ایک غزل نمونے کے طور پر  
بالمقابل یہاں نقل کر دی جائے۔

### یقین

۱۔ کون کر سکتا ہے اس خلاقِ اکبر کی ثنا  
نارسا ہے شان میں جس کے ہمیر کی ثنا  
۲۔ سربراہ اس منہ سے ہو سکتی ہے کعبتِ رسول  
یا ابوبکر و عمر، عثمان و حیدر کی ثنا  
۳۔ یہ زباں قابل ہے کب اس بات کے کیجئے  
حضرت زہرا کی اور شبیر و شہر کی ثنا

### صاحب

۱۔ کیوں کہ ہو مخلوق سے خلاقِ اکبر کی ثنا  
بت کتیں طاقت کہوے جو بت گر کی ثنا  
۲۔ حمد میں خلاق کے جس طور میں معذور ہوں  
ویسے ہی ہوتی نہیں مجھ سے ہمیر کی ثنا  
۳۔ جو کوئی صدق و عدالت اور حیا و علم کے  
باب ہیں۔ ان کی ثنا ویسے ہی منظر کی ثنا

۴۔ کوثر و تسنیم سے اپنا دہن ہولوں تو ہو  
 ۴۔ نام حمد اور مدح کا لینا مجھے انصاف نہیں  
 حضرت خیر لہسا، اور دونوں سروں کی  
 کی ہر ساری عمر ترکانِ سنگر کی ثنا  
 ۵۔ پر تو آزاد سے صاحب میں نوزانی ہوا  
 ۵۔ جو ناز اپنے پہ صبح و شام لازم کرتے  
 فرض ہی میرے پل سے مہرِ نوز کی ثنا  
 حضرت اہتا و یعنی شادِ منظر کی ثنا  
 خیر شفیق اور یقین کے کلام میں تو زمین و آسمان کا فرق ہی۔ آج کوئی صنایع  
 اس زمین میں ایسے چھوٹے چھوٹے اور سیدھے سادھے الفاظ میں ایسی حمد و نعت  
 اور مدح لکھیں تو جانوں۔

یقین کے کلام کے تتبع کا شوق تمام ہندوستان میں آگ کی طرح پھیلا ہوا  
 تھا۔ یہ شوق صرف شمالی ہند ہی تک محدود نہ تھا۔ دکن میں بھی اس کے بہت  
 پروتھے۔ اسی پیروی کی وجہ سے بعض تذکرہ نویسوں نے شیر سنگھ ظہور سیتارام  
 عمدہ اور عبدالولی غزلی کو یقین کا شاگرد لکھ دیا ہے۔

۱۱ شیر سنگھ ظہور۔ ان کا کچھ حال معلوم نہ ہو سکا۔ ۱۲ سیتارام عمدہ۔ یہ ذات کے کشمیری تھے  
 کشمیری میں پیدا ہوئے۔ وہاں سے اپنے بھائی راجہ دیارام پنڈت کے ساتھ دہلی میں آئے۔  
 عمر میں یقین سے بہت بڑے اور سراج الدین خاں آرزو کے ہم عصر تھے۔ یقین کے کلام سے  
 ایسے متاثر ہوئے کہ اس کا تتبع اختیار کیا۔ بعض تذکرہ نویسوں نے ان کو یقین کا شاگرد بھی  
 لکھا ہے۔ ۱۳ میر عبدالولی غزلی ابن میر سعد اللہ سہت کے رہنے والے تھے۔ بعض تذکروں  
 میں لکھا ہے کہ لکھنؤ کی نواح کے باشندہ تھے۔ یہ خاندان بزرگی، علم و فراست میں بڑا مشہور تھا اور  
 (بقیہ نوٹ بر صفحہ آئندہ)

یقین کی زبان (۱) | یہ وہ زمانہ تھا کہ اردو زبان بن رہی تھی اور اس کو اس قابل کیا جا رہا تھا کہ شاعری میں خیالات کا پوری پوری طرح اظہار کر سکے۔ اس غرض کی تکمیل کے لئے سب سے پہلے فارسی پر نظر پڑی۔ اسی زبان کے محاوروں کو اردو کا لباس پہنایا گیا۔ اور آخر یہ زبان پر استعمال ہوتے ہوتے ایسے رواں ہو گئے کہ شبہ بھی نہیں ہوتا کہ یہ فارسی سے لئے گئے ہیں۔ نمونہ کے طور پر چند شعر نقل کرتا ہوں۔

نامح جو یہ نصیحت بے جا نہ میں سنی      معذور رکھیو "مجھ کو میرا دل بجا نہ تھا

معذورداشتن اور بجا نہ ماندن کا ترجمہ ہے۔

مرنے کی طرح میں نے جو یہ اختیار کی      دیکھا تو زندگی میں فرا کچھ رہا نہ تھا

طرح اختیار کردن یا طرح انداختن کا ترجمہ ہے۔

لذتیں ساری گرفتاری کی جاتی ہیں بباد      جب نفس میں یاد آتی ہے گلستاں کی ہوا  
بباد رفتن سے یہ محاورہ اردو میں آیا۔

(بقیہ نوٹ صفحہ گزشتہ) شہنشاہ اوزنگ نیب کو ان لوگوں پر بڑا بھروسہ تھا۔ اپنے والد کے انتقال کے بعد عزت دہلی آئے یہاں ان کو اہل علم کی صحبت ملی اور یہیں نچیتہ گوئی کا ان کو شوق ہوا۔ بعد میں دہلی سے یہ مرشد آباد گئے اور نواب الہ دردی خاں کے مصاحب ہو گئے۔ نواب کے انتقال کے بعد انھوں نے دکن کا رخ کیا۔ حیدرآباد میں قیام کیا اور یہیں پونہ زمین ہوئے۔ ہندی کے دوپہرے اور کبت کہنے میں بھی ان کو کمال حاصل تھا۔ ہندی میں نوگس تخلص کرتے تھے۔ تاریخ انتقال کا پتا نہیں چلا ابھی ۱۱۴۵ھ تک زندہ تھے ۱۲

رُو اگر دیکھے اس کو بھی تو کچھ عیب نہیں آئینہ سے بھی گیا۔ کیا دل حیراں میرا  
رُو دادن سے یہ محاورہ لیا گیا تھا۔ لیکن چلا نہیں۔ ترک کر دیا گیا۔

خوب دُحی میں میرے بد خوکل جاتے ہیں آہ کیا غلط کرتے ہیں میرے چشم بنیائے طرح  
غلط کردن کا ترجمہ ہے۔ اب صورت بدل گئی۔ غلط کرنے کی بجائے غلطی کرنا

بولتے ہیں۔

نہیں ہیں فرصت کہ اب کے ساں بانڈھیں آشیان  
باغبان کا حکم یوں ہے۔ اے گلستاں الوداع  
آشیاں سبتن اپنی اصلی شکل میں آردو میں آیا تھا۔ اب اشیاں بنا بنا بولتے  
ہیں۔ پھر بھی یہ اپنی اصلی شکل میں حیدرآباد میں استعمال ہوتا ہے۔ یہاں مکان بنانے کو  
مکان بانڈھنا کہتے ہیں۔

متروکات (۲) | تعجب ہوتا ہے کہ میرا سودا اور درد یقین کے بہت عرصہ بعد  
زندہ رہے اور اس زمانہ تک آردو نے بہت کچھ ترقی کر لی تھی۔ بہت سے الفاظ  
ترک ہو گئے تھے اور ان کی بجائے نئے الفاظ داخل ہو چکے تھے۔ لیکن الفاظ  
متروک یقین کے ہاں اس قدر کم آئے ہیں کہ اس زمانہ کے شاید ہی کسی شاعر کے  
ہاں آئے ہوں گے۔ انگلیوں پر گنے جاسکتے ہیں اور آئے بھی ہیں تو ایک ایک دشمنوں  
میں آئے ہیں۔ یہ نہیں کہ ہر شعر میں کوئی نہ کوئی ترک شدہ لفظ موجود ہو۔ ان کے  
ہاں جیونا بجائے جنیا۔ کیدھر بجائے کدھر۔ بو جھنا بجائے جانا۔ جاگہ بجائے  
جاگہ۔ تمام دیوان میں ایک ایک جگہ اور ایدھر بجائے ادھر۔ سستی اور سستی

بمعنی سے دو دو جگہ آیا ہے اور بس یوں بجائے مرنے کے بھی دو جگہ استعمال کیا ہے  
لیکن مجھے اس لفظ کو متروک کہنے میں زرا تاثر ہے۔ اس کے معنی ”مرنے“  
سے کچھ مختلف ہیں۔ جہاں یہ لفظ استعمال ہوا ہے وہاں ”مرنے“ کا لفظ رکھ کر  
دیکھ لو۔ لطف جاتا رہتا ہے۔

تعمیریں (۳) | معلوم نہیں کہ کیوں شعرا پر قدیم تعمیر کو عیب نہیں سمجھتے تھے۔ بولنے  
میں تو تعمیر ایسی بڑی نہیں معلوم ہوتی ہاں تحریر میں بڑی کھٹکتی ہے۔ چونکہ اس  
زمانہ میں یہ کوئی عیب نہ تھا۔ اس لئے یقین نے بھی اس کو جائز سمجھا استعمال کیا ہے  
پھر بھی اس کی کمی ظاہر کر رہی ہے کہ جہاں تک ممکن تھا انہوں نے اس سے بچنے کی  
کوشش کی ہے۔ جو دو چار بہت بڑی تعمیریں سارے دیوان میں آئی ہیں ان کو یہاں  
نقل کئے دیتا ہوں۔ تعمیر معنوی دیوان بھر میں صرف ایک جگہ آئی ہے:

اب جوں مرشک خاک سے سکنا نہیں تو آٹھ آگے میں دل کی آنکھ سے ایسا گرانا تھا  
گو رہیں جاوے گا خمخانہ کی حسرت لے یقین لے گیا ہمیشہ جوں عالم سے گنہینے کا داغ  
ہو ادیوانگی میری کا وہ گل پرین باغ کہ ہوتا ہے جنوں کے شور کو سیرِ حمن باغ  
مگر یہ سب تعمیریں ایسی ہیں کہ اب بھی بہت کم شعرا ان سے اجتناب کرتے  
ہیں۔ کوئی سا دیوان بھی اٹھا کر دیکھ لیجئے یہ کمزوری عالمگیر پائے گا

تذکرہ تالیف (۴) | یقین کے کلام میں اکثر الفاظ ایسے ہیں جو اب مذکر سے مونث  
اور مونث سے مذکر ہو گئے ہیں۔ یقین نے ہر جگہ مبل کو مونث بانڈھا ہے لیکن صرف

اس شعر میں مذکر کر دیا ہے

یقین، بلبل کہاں ہوتا ہے پید اس سلیقہ کا کیا ہے منتخب خواہاں کے منہ کا گلستاں تو نے

یہاں یہ لفظ مونت بھی آسکتا ہے۔ مگر جس قدر نسخے میں نے یقین کے دیوان کے دیکھے

ان میں یہاں بلبل مذکر آیا ہے۔ چونکہ بلبل کو خود اپنے سے تشبیہ دی ہے اس لئے

شاید اس لفظ کو یہاں مذکر کر دیا ہے۔ لفظ سیر اس زمانہ میں مذکر تھا

ہوا دیوانگی میرے کا وہ گل پیرین باعث کہ ہوتا ہے جنوں کے شور کا سیر چمن باعث

میر صاحب نے بھی اس لفظ کو مذکر بانڈھا ہے

ملا ہے خاک میں کس کس طرح کا عالم یہاں نکل کے شہر سے ٹک سیر کر فراروں کا

اسی طرح مرگ کو بھی مذکر بانڈھا ہے

محبت کا نہیں ہے ظلم بھی خالی عدالت سے ہوا پر ویز کے جینے کا مرگ کو بہن باعث

لفظ تلاش بھی اس زمانہ میں مذکر تھا

رات دن خوابوں کو ہر دہائے منقوں کا تاش روز و شب لیلیٰ کو تھا درپیش محبوں کا تاش

قافیہ (۵) | پہلے زمانہ میں (ر) اور (ڑ) کا قافیہ جائز سمجھا جاتا تھا۔ چنانچہ

شاہ حاکم نے بھی اپنے دیوان کے دیباچہ میں لکھا ہے کہ :

”سر کو دھڑ کا قافیہ بانڈھا جاتا تھا۔ مگر میں نے اس کو ترک کر دیا۔“

یقین نے بھی ایک آدھ جگہ اس کا استعمال کیا ہے۔ قافیہ مع ردیف زور

اور شور تھا۔ اس غزل میں دو شعر لکھے ہیں



عشق کے آئین میں صورت کیونکہ بچے ان کا دین  
جو کہ جاتے ہیں طرف کعبہ کی بت خانے کو چھوڑ  
خدمتوں میں بھی تجارت سے ہر زیادہ منفعت  
رشتوں سے تعلق لاکھوں روپے کے لیے ہیں کھوڑ

آخر شعر سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانہ میں رشوت کا بڑا زور تھا۔ سودا کے  
ہاں بھی کئی جگہ کا قافیہ بڑبڑھا ہے۔ لکھتے ہیں سے

ساقِ سیمیں تری شبِ بیکہ کے گوری گوری شرم سے شمع ہوئی جاتی ہے تھوڑی تھوڑی  
رعایت لفظی (۶) | یقین کے کلام میں رعایت لفظی ضروری مگر جیسے آٹے میں نمک۔

بعض جگہ یہ رعایت بے لطف ہو گئی ہے

مجھے دکھ پھر دیا تو نے منڈا کر سبزہ خط کو  
جراحت کو میری وہ مریم زنگار بہتر تھا  
جلتے جلتے سے نہ مل ان تلیاں کپڑوں کے ساتھ  
جی دھڑکتا ہے مبادا لگاٹھے دہن کو آگ  
کر دیا آنکھوں کے رونے نے میرے دل کو تنگ  
کب تک گرمی کروں اس مردمِ آبی کے ساتھ

منفعل ہوں سخت جانی سے میں اپنی مجھ پیچید  
جن قدر تو سنگوں ہے اتنی مینائی نہیں  
عجیب غریب تیرے کیس (۷) | لفظ مینائی کی ترکیب قابل غور ہے۔ اسی لفظ کو ایک دوسری  
جگہ لائے ہیں۔ اس کے ساتھ ہی شکن مشتاق دل کی ترکیب کو بھی دکھینا چاہیے۔

شکن مشتاق دل میرا ہوا ہے سخت سودالی

جہاں یہ دیکھتا ہے سنگ ہاں کرتا ہے مینائی

شعر کے یہ معنی ہوئے کہ میرے دل کو ٹوٹنے کا ایسا شوق ہے کہ جہاں تھرد دکھتا  
ہے وہاں شیشہ بن جاتا ہے۔

نہیں ہوتی کسی اجباب کی خاطر ملوں اس سے خدا شاہد عجب بے بد مصاحب ہی تہنائی

شاعر کہتا ہے کہ واقد تہنائی ایسی اچھی مصاحب ہے کہ اس سے کسی دوست کے دل پر

غبار نہیں آتا۔ ورنہ مصاحب تو اس بلا کی لگائی بھجائی کرتے ہیں کہ بڑے

بڑے دوستوں کا دل ایک دوسرے سے پھیر دیتے ہیں۔

کہاں سکتے ہیں چڑھ مٹھہ پر تباہ ناز و تمکس کے

کہ ہیں ہم صبر کے بے چرخ مفلح ہیں دل و دین کے

شعر میں بڑی تعقید ہے۔ بے چرخ کے دو معنی لئے جاسکتے ہیں ایک تو یہ کہ

چرخ کرنے کو کچھ نہ ہو۔ دوسرے بدشگون کے خیال سے برعکس محاورہ استعمال

کیا ہے۔ جیسے دسترخوان اٹھانے کو دسترخوان بڑھانا کہتے ہیں۔ گویا ہے تو

بہت کچھ پاس مگر خراج کرنے کا موقع نہیں۔ اس کے برعکس معنی وہی مفلح کے لئے

بدگمان زراہد بقیں سے یا کبازوں پر نہر دیکھ کیسے سر پر پڑے گا بے گناہوں کا دل

ترکیب مقلوب ہے۔

تیری لہوں سے دل شیون میں ایسا ہے کہ گرسنا صد اس چینی مودار لی مغفور رود تیا

چینی مودار بہت بری ترکیب ہے۔ سودا نے اس فارسی ترکیب سے اجتناب

کر کے لکھا ہے

کب دل شکستہ لب پر ہماں عرض حال آیا ہے صد وہ چینی جس میں کہ بال آیا

جاننا تھا کہ بہن۔ شیریں کی دل سختی کا لطف  
جس کو ہوسرھوڑنا جانے وہ ہی تھپڑ کی قدر  
یہاں بھی ترکیب مقلوب کا استعمال ہوا ہے۔

حروف کا ترک (۸) کہیں کہیں یقین نے حرفوں کو بھی گرا دیا ہے۔ مثلاً :  
رفیقانِ موافق ساتھ زبداں بھی گلستاں ہے ہوا ہے دام ہم کو آیشاں۔ پس کی لفت سے  
اس شعر میں حرف ”کے“ ترک ہو گیا ہے۔

گلی میں باہ کی دل بھول جا پڑا تھا یقین  
پھر ان دنوں سے یوانہ کا کچھ سراغ نہیں  
یہاں حرف ”کر“ محذوف ہے۔

ناصر جو یہ نصیحت بے جا نہ میں سنی  
معذور رکھ تو مجھ کو میرا دل بجانہ تھا  
یہاں ”نے“ چھوٹ گیا ہے اور نہیں کی جگہ ”نہ“ استعمال ہوا ہے۔

ہم مضمون اشعار | اس کے بعد میں وہ اشعار دیتا ہوں جو یا تو فارسی سے ترجمہ  
کئے گئے ہیں۔ یا ان کا مضمون اردو میں لیا گیا ہے یا دوسرے ریختہ گوئیوں کے  
اشعار کے ہم مضمون ہیں لیکن ہر صورت میں آپ دیکھئے گا کہ یقین کے ہاں جہت کا  
پہلو ہے۔ اگر کسی فارسی شعر کا مضمون اردو میں لیا ہے یا ترجمہ کیا ہے تو اس کو  
اصل شعر سے بہت بڑھا دیا ہے یا الفاظ کو اس طرح بٹھایا ہے کہ مضمون کی وسعت  
کے ساتھ طرزِ ادا میں شوخی پیدا ہو گئی ہے۔ پہلے ان کے استاد ہی کے شعر سے  
بسم اللہ کرتا ہوں :۔

(مرزا منظر) اے بادِ صبا ادب ضرورست  
اس مشہدِ باست گلستاں غنیت

(یقین) یہ بلبلوں کا صبا مشہد مقدس ہے۔ قدم سنبھال کے رکھو نرا یہ باغ نہیں  
 یقین کے ہاں غضب کی شوخی ہے اور لفظ ”نرا“ نے شعر میں جان ڈالی  
 ہے۔ ان دونوں شعروں کے دیکھنے سے بھی استادا اور شاگرد کے کلام کا فرق  
 معلوم ہو سکتا ہے۔

(حافظ) بکھشائے ترتم را بعد از وفات و بگر کز آتش دروغم دو دواز کفن بر آید  
 (یقین) اس داغِ دل کو گارو نہ ساتھ میرے ڈرتا ہوں مت لگے اٹھ آتش میرے کفن میں  
 یقین کے اس شعر کو بھی توار دکھا جاتا ہے۔ طریقہ ادا اور وسعت معنی کے  
 لحاظ سے دیکھا جائے تو یہ شعر حافظ کے شعر سے بڑھ گیا ہے۔

(حافظ) گفتم خوشا نسیم کز باغِ خلد خیزد گفنا خاک سوائے کز کوئے دلبر آید  
 (یقین) دل میں رہ کر جو حبت کی بولہ لگی ہے سو کو چہ یار میں کیا سایہ دیوار نہ تھا

(حافظ) چوں پر شدی حافظ از میکہ بیرون شوی رندی و خراباتی در عهد شباب اولی  
 (یقین) عشق کو ایام پیری میں یقین موقوف رکھ کیوں کچھ پڑتا ہے بڑھاپے میں جانوں کی طرح  
 حافظ نے اپنے شعر میں کوئی گنجائش نہیں رکھی تھی۔ لیکن یقین نے دوسرے  
 مصرعہ میں وجہ کا اظہار کر کے شعر میں وسعت پیدا کر دی ہے۔ حافظ صرف  
 کہتے ہیں کہ ”ایسا کرنا کچھ اچھا نہیں معلوم ہوتا“ یقین کہتا ہے کہ ”پہلے اپنے  
 ڈنڈ قبضوں کو دیکھ لو۔ کیوں خواہ مخواہ پینے کا ارادہ کیا ہے“

ان دونوں شاعروں کی تعلق بھی بہت ملتی جلتی ہے۔

(حافظ) درآسماں چہ عجب گرزگفتہ حافظ  
 سماع زہرا بہ رقص آورد مسیحا را  
 (یقین) سخن کے سحر سے نزدیک ہے یقین کہ کسی  
 مری زمین غزل دیکھ کر یہ گردوں رقص  
 یقین کے الفاظ کی نشست و مناسبت کسی طرح حافظ کے شعر سے کم نہیں ہے۔  
 (حافظ) شب تارست درہ وادی ہمن دریش  
 آتش طور کجا وعدہ دیدار کجا است  
 (یقین) فیض ہوتا ہے کہیں پر نہ مکاں پر نازل  
 ہے وہی طور لے شعلا دیدار کہاں

(سعدی) سرور امانی ولیکن سرور ارفار کو  
 ماہ رمانی ولیکن ماہ رگفتار نیست  
 (یقین) یار کے قد کو نہ دے سرو سے تشبیہ یقین  
 سرکشی میں تو مسلموں نے طناز نہیں  
 سعدی نے یار کے قد کو سرو سے تشبیہ دی ہے۔ مگر رفاکار نے ہونے کی وجہ سے  
 اس کو قد یار سے کمتر کر دیا ہے۔ یقین نے بھی وہی تشبیہ دی ہے۔ مگر نقص کی وجہ سے  
 دوسری بتائی ہے۔ شاعر سمجھ سکتے ہیں کہ ”طناز“ کا لفظ ”رفکار“ سے کہیں زیادہ  
 بہتر ہے۔ ہاں جس نے کسی ”بت طناز“ ہی کو نہ دیکھا ہو وہ اس شعر کا لطف  
 نہیں اٹھا سکتا۔

(سعدی) پائے در زنجیر پیش دوستاں  
 بہ کہ با برگانگاں در بوستاں  
 (یقین) رفیقان موافق ساتھ زنداں بھی گلستاں  
 ہوا ہوا دام ہکو آشیان پس کی لفت سے  
 معنی دونوں شعروں کے ایک ہی ہیں مگر یقین طریقہ ادا اور مناسبت لفظی

میں یقیناً سعدی سے بڑھ گیا ہے۔

(سعدی) برگِ رخسارِ سبز و نظرِ ہوشیار  
 (یقین) ڈھب نہیں ہے خلق کی آنکھوں کو نظارہ کا  
 (سعدی) مجو چشم و فائزین بلباں چشم  
 (یقین) گل و بلبل کی صحبت کیا نہیں دکھی یقین نے  
 ہر وقتے دفترے ست معرفتِ کردگار  
 بھر رہا ہی رنگ سے جلوہ کے قدرتِ کاچن  
 کہ ہر دم بر گلِ دیگر سر ایند  
 جو امید و فارق تھا ہی تو ان خوب ویاں سے  
 یقین نے جس خوبصورتی سے اس مضمون کو ادا کیا ہے وہ تعریف کے قابل ہے  
 پہلے عاشق و معشوق کی حالت کا نقشہ دکھا دیا۔ اور اس کے بعد نصیحت کی نصیحت کا

بہترین طریقہ ہی ہوتا ہے۔

(ملاشیدا) طالعِ شہرتِ رسوائی مجنوں میں ست  
 (یقین) یقین اقبال ماتہ آما نہیں کھجی کے جانے سے  
 ورنہ طشتِ من او ہر وزیک نام افتاد  
 نہیں ہونے کے ہم فرہاد گر سو بار حیرتیں  
 ملاشیدا کا شعر ضربِ لہلہ ہو گیا ہے۔ مگر انصاف شرط ہے یقین کا شعر بھی کچھ  
 اس سے دبا ہوا نہیں ہے۔ کہتا ہے ہم بھی آدمی ہیں فرہاد بھی آدمی تھا۔ ہم بھی عاشق ہیں  
 وہ بھی عاشق تھا۔ قسمت کی بات ہے کہ وہ اتنا مشہور ہو گیا۔ ہم سو دفعہ بھی مر کر جنیں تو  
 اس جیسا نام نہ پائیں گے۔

۱۵ ملاشیدا۔ فتح پور کے شیخ زادوں میں تھے جہانگیر بادشاہ کے آخری زمانہ میں ان کی شاعری نے  
 شہرت پکڑی۔ زرا منہ پھٹ تھے اس لئے دربار میں جیسا چاہیے ویسا اثر پیدا نہ کر سکے۔ ملاشیدا  
 بمقام کشمیر انتقال کیا اور وہیں دفن ہوئے ۱۲

مکن در حیم و جان منزل کہ این دون ست آن ادنیٰ (سنائی)  
 قدم زین ہر دو بیرون نہ نہ اینجا باشونے آن جا  
 یارگر منظوری دنیا و عقبی سے گزر منزل مقصود ہی دونوں جانوں کے پکے (یقین)

یقین نے بعض فارسی محاروں اور ضرب الامثال کو بھی اُردو کا جامہ پہنایا ہے۔  
 دیکھنا ”ہیں گوے وہیں میداں“ کو کیا خوبصورتی سے بانڈھا ہے  
 مجنوں نے جو یہ دھومیں دُوری سے مچائی ہیں ہنشتہ تو آجائے۔ یہ دشت یہ دیرانہ  
 ”ایں گنا ہے ست کہ در شہر شمانیز کند“ کو اُردو کے رنگ میں ملاحظہ کیجئے  
 کیا ہوگا نہ تو کیا یار کی گلیوں میں۔ اتوں کو نئی تقصیر میں نے ہی نہیں کی۔ اے عرس چہ  
 اب یقین اور اس کے چند معاصرین اور متاخرین کے اشعار کا مقابلہ کر کے اس  
 بحث کو ختم کرتا ہوں۔ جن کو خدا نے شوق اور ذوق دیا ہے وہ خود بہت سے اشعار  
 مقابلہ کے لئے نکال لیں گے۔ میں اپنے اوپر کیوں خواہ مخواہ بار لوں۔

اب تلک یراں پڑا ہی یہ جنوں کا پخت (یقین)  
 پھر کسی نے بعد مجنوں کے نہ دی ہاموں کی داد  
 میرا سچ ہے کہ ہر مکان کی رونق مین سے  
 مجنوں جو مر گیا ہی تو جنگل اُداس ہے  
 (یقین) جی میں آتا ہے تھے قد کو دکھا دیجئے اسے  
 باغ میں اتنا کر ٹاٹا ہی یہ شمشاد کہ بس  
 (میرا) سرو و شمشاد چمن میں قد کشی کی نزع  
 تم زرا وہاں چل کھڑے ہو فیصلہ ہو جائے گا  
 میرے اس شعر کی ہمیشہ تعریف کی جاتی ہے۔ مگر میری سمجھ میں نہیں آتا کہ اس کے

معنی کیا ہیں۔ سرد اور شمشاد میں جھکڑا ہے۔ اگر باروہاں گیا تو میں ماننے کو تیار ہوں  
 کہ دونوں شرمندہ ہو جائیں گے۔ مگر ان دونوں میں جو جھکڑا ہے وہ کیوں کر رفع ہوگا  
 اور کس کو کس پر ترجیح دی جائے گی یقین کے ہاں یہ کمزوری نہیں ہے۔ وہ کہتا ہے  
 کہ شمشاد اپنے قدر بہت اٹھیٹا ہے۔ تم کو لے جا کر وہاں کھڑا کر دیتے ہیں وہ خود بخود  
 شرمندہ ہو کر جھک جائے گا۔ اگر نے کی انتہا ”کہ بس“ سے ظاہر کی گئی ہے۔ اس سے  
 پیارا لفظ اس موقع کے لئے زبان اردو میں تو نہیں مل سکتا۔

(یقین) لاچار لیکے دل کو گیا گور میں یقین اس خلیں کا جہاں میں کوئی قدر اس نہ تھا  
 (میر) کوئی خواہاں نہیں ہمارا میر گو سیا جلس ناروا ہیں ہم  
 (یقین) نہ وہ دل ہم نہ وہ شور جنوں ہی سیر گل مت کر

رفیقوں بن یقین گزار میں جانے کا کیا حاصل  
 (سودا) وہ ہم نہیں کریں سیر بوستاں تنہا بہشت ہو تو نہ منہ کیجے باعباں تنہا  
 (یقین) ہم سے گر سرنہ نوا اہل تکبر کا تو کیا فخر آدم ہی جو ابیس کا مسجود نہیں  
 (احسان) کر سجدہ تعظیم بزرگوں کو ضرور آدم کو جو سجدہ نہ کرے شیطاں ہی

۱۵ احسان۔ نام عبدالرحمن خاں تخلص احسان اور خطاب مصمصام الدولہ تھا۔ ذوق سے پہلے ان کا  
 دہلی کے قلعہ میں بڑا دور دورہ تھا۔ تمام قلعہ ان کا شاگرد تھا۔ جگت اتا دمانے جاتے تھے۔  
 ۸۵ برس کی عمر پر ۱۲۶۶ء میں دہلی ہی میں فوت ہوئے ۱۲



(یقین) شوق کہتا ہے کڑے لوں ڈر کر دامنِ یا  
 کیا کروں مستی سے کچھ ہاتھوں میں گہرائی نہیں  
 (حضور) نہ پاؤں میں جنبش نہ ہاتھوں میں طاقت  
 جو اٹھ کھینچیں دامن ہم اس دل رُبا کا  
 سر راہ بیٹھے ہیں اور یہ صدا ہے کہ اللہ والی ہے بے دست و پا کا

(یقین) یہ جیوے ہجر میں وہ وصل میں بھی جی نہیں سکتا  
 تکلف برطرف۔ بلب کو پروانہ سے کیا نسبت  
 (لا اعلم) نسبتِ مستی سے دوپٹے کے تہیں اس سے اس کو تو کوئی نسبت ہی نہیں  
 دیتی ہے یہ جان تو مردے کے لئے وہ گردِ بھی شمع کے پھرتا بھی نہیں  
 یقین کا شعر ایسا ہے کہ وہ زبانِ اردو کے لئے باعثِ فخر ہے۔ کیا بلحاظ مضمون اور  
 کیا بلحاظ تشبہ الفاظ ایسے شعر کسی زبان میں ذرا مشکل سے ملیں گے۔ یہی کیا  
 دیوانِ یقین میں اکثر ایسے اشعار ہیں جن کے متعلق کہہ سکتے ہیں کہ جو اہر پارے تھے  
 جو ہماری عقلمندی سے خاک میں دبے پڑے تھے۔ اگر باہر آنے کے بعد بھی ان کی قدر  
 نہ ہوئی تو یہ ان کا قصور نہیں ہمارا قصور ہوگا۔

(یقین) مصر میں حسن کی ڈگری بازار کہاں جنس تو ہے۔ پہ زلیخا سا خریدار کہاں  
 (بیان) کوئی اس جنس کا دلی میں خریدار نہیں دل تو حاضر ہے لیکن کہیں دل دار نہیں

لے لالہ بالکنڈ حضور۔ دہلی کے رہنے والے اور خواجہ میر درد کے شاگرد تھے۔ زبانِ عربی  
 بھی واقف تھے۔ اسی برس کی عمر پا کر دہلی میں ۱۲۶۲ھ کے قریب فوت ہوئے ۱۲

(یقین) مت اخلط کرے نوہارا اب ہم سے  
 (انشا) نہ چھڑے نگہت با دہاری اہ لگ اپنی  
 چمن میں موندنے کا اس خاک کو دماغ نہیں  
 تجھے اٹھیلیاں سو جھی ہیں ہم بیزار مٹھے ہیں

(یقین) زیارت باغ کی کرتی ہی آنسو سے وضو کر کے  
 (ذوق) غرض تھی کیا تیرے تیروں کو آبِ بیکار سے  
 جناب گل میں کھتی ہی عجب صدق و صفائے  
 مگر زیارتِ دل کیوں کہ بے وضو کرتے

(یقین) نمکِ لالی مجھ میں اے ہما شورِ محبت نے  
 (ذوق) واہ واہ شورِ محبت خوب ہی چھڑکا نمک  
 کہیں کھائے ہیں تو نے اس مزے کے استخوانِ سچ کہہ  
 استخوانِ میرے ہما کس کس مزے سے کھائے ہی

(یقین) اے واعظ ہمارے پاس ہی اس محبت کی  
 (ذوق) ہمارے سینہ میں وہ آہِ آتش ہی ذوق  
 کہ جس کو دیکھ زہرہ آب ہو جائے جہنم کا  
 کہ برق دیکھے تو فی النار و السقر ہو جائے

(یقین) اگر نجیر ہیں یاد کر نہیں سکتا  
 (غالب) قطع کیجئے نہ تعلق ہم سے  
 کہ جو بُرا ہی ہیں کہ تیرا بھلا ہووے  
 کچھ نہیں ہی تو عداوت ہی سہی

(یقین) شکوہِ حسن سے آنسو ہمارے سو کہ جاتے ہیں  
 (غالب) پر تو خور سے ہی شبنم کو فنا کی تعلیم  
 یقین سورج کے آگے گبا اثر رہتا ہی شبنم کا  
 میں بھی ہوں ایک عنایت کی نظر موندنے تک

یقین، عمر فریاد میں برباد گئی۔ کچھ نہ ہوا  
 نالہ مشہور غلط ہے کہ اثر کرتا ہے  
 (غالب) غلطیہائے مضامین مت پوچھ  
 لوگ نالہ کو رسا باندھتے ہیں

یقین، اب تو کیلے نگہ لطف کہ ہو تو شہِ راہ  
 کہ کوئی دم میں یہ بیمار سفر کرتا ہے  
 (امیر سیائی) دمِ اخیر تو ظالم کوئی نگاہ ملے  
 کچھ اس غریب مسافر کو زاد راہ ملے

### یقین کا ایک شعریے

خلوت ہو اور شراب ہو معشوق سامنے  
 زاہد تجھے قسم ہے جو تو ہو تو کیا کرے  
 اسی مضمون کو محمد صادق خاں اختر نے لے کر قطعہ کیا ہے اور وہ قطعہ ایسا مرغوب ہوا  
 کہ سراج الدین بہادر شاہ ظفر کے ولی عہد مرزا فخر و المتخلص بہ رمز نے اس کو خمسہ کیا۔  
 محمد حسین آزاد نے اس خمسہ کو ذوق سے منسوب کیا ہے۔ قطعہ مزے کا ہے اس لئے  
 لکھ دیتا ہوں۔ قطعہ کو یقین کے شعر سے ملا کر دیکھئے اس نے ایک ہی شعر میں سارے  
 قطعہ کا رنگ پیدا کر دیا ہے۔  
 کل بن کے شیخ مجتہدِ عصر سا قیما! دکھلا کے باغِ سبز عذاب و نواب کا

اے قاضی محمد صادق خاں اختر ہنگلی کے رہنے والے تھے۔ کچھ دنوں لکھنؤ میں بھی آکر رہے۔ مرزا  
 قیس کے شاگرد ہوئے اور یہیں تحصیلدار ہو گئے۔ تذکرہ آفتابِ عالمیاب، محمد حیدری اور دیوان فارسی و  
 ریختہ ان کی یادگار ہیں۔ فنِ شعبہ اور کمیابگری میں بھی دخل تھا۔ ۱۲۹ھ کے قریب انتقال کیا۔ ۱۲

کہنے لگا زراہ تجھے بطن پر  
 ہم نے کہا کہ یہ تو ہیں تم خوت جانتے  
 گستاخی ہو معاف تو ایک عرض میں  
 تقویٰ ہمارے آگے ہو جب آپ کا دست  
 قے ہووے کب باغ ہو ساقی ہو ہوش  
 گردن میں ہاتھ ڈال کے وہ شوخ بیجا  
 کھینچے منسی سے اپنا وہ منہ سے ملا کے منہ  
 منست یوں کہے کہ ہمارا لہو پیئے  
 اس وقت ہم سلام کریں قبلہ آپ کو  
 اور امتحاں بغیر تو یہ آپ کا غلام  
 معلوم ہو گا حشر میں پیا شراب کا  
 پر کیا کریں کہ ہر ابھی عالم شباب کا  
 کیجئے نہ آپ مجھ کو جو مور عتاب کا  
 اور ہولتین آپ کے پاس احتیاب کا  
 اور وہاں کوئی کھل نہ ہو باعث حجاب کا  
 دے ذائقہ زباں کو دہن لعاب کا  
 یہ ریش جس میں جلوہ ہے رنگِ خضاب کا  
 گر پی نہ جائے جلد پیالہ شراب کا  
 گر آپ خوف کیجئے روز حساب کا  
 قابل نہیں ہے قبلہ کسی شیخ و شاب کا

قطعہ اچھا ہے اور واقعی اچھا ہے۔ مگر یقین نے جو بات دو مصرعوں میں پیدا کر دی  
 ہے وہ اس میں نہیں ہے۔ اس نے تین چیزیں یعنی معشوق، شراب اور خلوت جمع  
 کر دی ہیں اس کے بعد زاہد سے پوچھتے ہیں کہ حضرت آپ ہی بتائیے کہ ایسے  
 موقع پر آپ کی نیت بگڑے گی یا نہیں۔ ان چیزوں کی موجودگی میں تو بڑے بڑے  
 زاہدوں کے تقوے ٹوٹ جاتے ہیں۔ بہر حال یقین کا یہ شعر میری زبان میں ”مثلاً“  
 اور آج کل کی زبان میں ”شاہکارہ“ ہے۔

عام قاعدہ ہے کہ اس قسم کے مضمون کے آخر میں شاعر کے بہترین اشعار کا انتخاب

دیا جاتا ہے۔ میں اس عام طریقہ کو ترک کرتا ہوں۔ ہر شخص کا مذاق جداگانہ ہوتا ہے۔ کیا ضرور ہے کہ جو شعر مجھے پسند ہو وہ آپ کو بھی پسند آئے۔ اس لئے میں آخر میں وہ اشعار دیتا ہوں جو زرا ابھی ہوئے ہیں اور جن کے سلجھانے میں کچھ دقت ہوتی ہے۔ ساتھ ہی اپنی عقل کے موافق ان کی صراحت بھی کر دیتا ہوں۔ اب یہ اچھے اشعار ان کا انتخاب خود ناظرین دیوان دیکھ کر کر لیں۔

نگی ہے سب خدائی نفی و اثبات پر اپنے موحّد دیکھ کر اس وقت کے منصور کیا کرتا یہاں خدائی کے معنی ”دنیا بھر کے لوگ“ ہیں شاعر کہتا ہے کہ آج کل ایسا رنگ بگڑا ہے کہ نفی و اثبات کے جس قدر مسائل ہیں وہ ہر کوئی اپنے سے متعلق کر رہا ہے۔ بچارے منصور نے ایک مسئلہ کو اپنے سے متعلق کیا تھا اس کو سولی دیدی گئی۔ اگر منصور ان لوگوں کو دیکھتا جو موحّد ہونے کے دعویدار ہیں تو خدا معلوم کیا نہ کر گزرتا اور خبر نہیں خدائی سے بڑھ کر اور کیا دعویٰ کر سکتا۔ دیوان کے ایک نسخہ میں پہلا مصرعہ اس طرح ہے ”گئے ہیں سب خدا کے نفی و اثبات اپنے پر“ اس مصرعہ میں زرا ابھی کم ہے۔ معنی وہی ہیں جو میں نے اوپر بیان کئے ہیں۔

گلشن حسن سپاہی کی جفا ہے آبیار رنگِ خو خوار سے کپڑے ہے شجاعت کا چمن سپاہی کا حسن اس کی بہادری ہے شعر کے معنی یہ ہوئے کہ جب جفا کی جائے اس وقت سپاہی کی بہادری اپنا رنگ دکھاتی ہے اور جتنی سختی کسی بہادر کے مقابلہ میں کی جائے اتنا ہی اس کی شجاعت کا اظہار ہوتا ہے۔

اصولِ عشق پہ تو لیں تو زمرہ اس کا نہیں درست جو طبل شکستہ بال نہیں اس شعر میں بڑی بڑی تعقید ہے۔ اس کو اگر اس طرح نہ لیا جائے تو معنی صاف ہو جاتے ہیں ”جو طبل شکستہ بال نہیں اگر اس کا زمرہ اصولِ عشق پر تو لیں تو درست نہ ہوگا“ یعنی ایسی طبل کے زمرہ

میں مزہا ہر جو شکستہ دل اور زخم خوردہ ہو اور اسی کا زمرہ اصول عشق کی میزان میں پورا اتر سکتا ہے۔  
 نگہ تیرے ہو جیسے عکس آئینہ کا چینی میں یہ سب باتیں سمجھ کر جان نثر مانے کا کیا حاصل  
 یہاں آنکھ کو آئینہ سے اور نگہ کو آئینہ کے عکس سے تشبیہ دی ہے اور یہ سائنس کے لحاظ سے  
 بالکل صحیح ہے۔ آنکھ لیس ہے اور نظر اس میں سے نکلی ہوئی معکوس شعاعیں دوسری تشبیہ معشوق کے  
 صفائی حسن کو چینی سے دی گئی ہے۔ شاعر کہتا ہے کہ میں تیری طرف اگر دیکھتا بھی ہوں تو خواہ مخواہ  
 تو شرماتا کیوں ہے میری نگاہ تیرے حسن پر جمتی تھوڑی ہے۔ یہ تو اس طرح گزر جاتی ہے جس طرح چینی پر  
 آئینہ کا عکس اثر کے بغیر تیرا ہے۔ تیرے کالفظ سارے شعر کی جان ہے اور دونوں تشبیہیں بالکل  
 نئی ہیں۔ دیوان کے ایک نسخہ میں پہلا مصرعہ یوں ہے ع نگہ تیری ہے میں جو آئینہ حیران رہتا ہوں  
 پہلے مصرعہ کی جگہ یہ مصرعہ لگا کر پڑھو تو شعر بالکل معمولی ہو جاتا ہے غالب نے بھی اس مضمون کو باندھا

ہے اور خوب باندھا ہے۔ فرماتے ہیں سے

نظارہ نے بھی کام کیا وہاں نقاب کا  
 مستی سے ہر نگہ تیرے رخ پر بکھر گئی

جب ہوا معشوق عاشق۔ در بانی کیا کرے بندگی کی جس نے خوکی۔ وہ خدائی کیا کرے  
 اس شعر میں کوئی پیچیدگی نہیں ہے صرف اس لئے لکھ دیا ہے کہ فطرت انسانی کے ایک مسئلہ کو اس میں تیری  
 خوبصورتی سے ادا کیا گیا ہے کہ اگر کوئی فاتح و مفتح ہو جائے اور ایک عرصہ تک اس غلامی میں بسر کرے تو  
 اس کے اخلاق ایسے خراب اس کے خیالات اور ارادے ایسے پست اور بہت ایسی جواب دہی جاتی ہے کہ پھر تو  
 تک اس میں حکومت کرنے کی قوت نہیں آتی۔ اور یہی وجہ ہے کہ اہلکاروں کو عہدہ ارنہانے اور سہ والوں کو  
 سوراخ دینے میں تامل کیا جا رہا ہے۔

لیجئے مجھے جو کچھ لکھنا تھا۔ وہ میں نے لکھ دیا۔ اب آپ جانے اور لہقین کا دیوان جانے خود پڑھ لیجئے  
 پسند آئے تو کتب خانہ کی زینت بنائے۔ ورنہ اٹھا کر طاق نسیاں پر رکھ دیجئے۔ والسلام  
 مرزا فرحت اللہ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

## ردیف (الف)

کون کر سکتا ہے اس خلاقِ اکبر کی ثنا  
سربِ آس منہ سے ہو سکتی ہے کب نعتِ رسول  
یہ زباں قابل ہے کب اس بات کے، جو کیجئے  
نامِ حمد اور مدح کا لینا مجھے نضا و نہیں

نار سا ہے نشان میں جس کے پیمبر کی ثنا  
یا ابو بکر و عمرؓ عثمان و حیدرؓ کی ثنا  
حضرت زہراؓ کی اور شہیر و شہر کی ثنا  
کی ہر ساری عمر، ترکانِ ستمگر کی ثنا

جوں نماز اپنے پہ صبح و شام لازم کر لیتیں  
حضرت استاد یعنی شاہِ منظر کی ثنا

نہ مرتا میں اگر صدقہ ترے جانے کے کام آتا  
 یہ کوہِ طور سر نہ ہو گیا سارا ہی کیا کہنے  
 بتاں خوں کر کے میرا سب لگے آپس میں یوں کہنے  
 اڑادی اس ہوانے مشت خاکِ مسکیناں ناحق  
 گرسنہ ناز کا تھا، گالیاں کھانے کے کام آتا  
 کوئی پتھر بھی بچ جاتا تو دیوانے کے کام آتا  
 یہ کافر جیوتا رہتا تو بت خانے کے کام آتا  
 غبار ان کا اگر رہتا تو پیمانے کے کام آتا

لیا گھیر اس لقمے نے عشق کا آشکارا

کوئی شعلہ بھی بیچ رہتا تو پرانے کے کام آتا

طلا تجھ حسن کے شعلہ کے آگے آج ہو جاتا  
 تجھے گرد دکھتیا رو پا پگل سیاب ہو جاتا

اثر خوبانِ فندقِ زیب کی انگلیوں میں دیکھا  
 کہ جو کرتا تھا اشکِ خوں ہاں عتاب ہو جاتا

کمی کی خیر قاتل نے اس کی پیاس کے چٹیکے  
 کمی زخم اور گر لگتے تو دل سیراب ہو جاتا

اگر تجھ کو زلیخا دکھتی سب کچھ پر جاتی  
 تاشا ماہ کسغانی کا اس کو خواب ہو جاتا

یقین، سوز و گداز اپنے کو گراٹھا میں کرتا

خدا شاہدی، آتش کا بھی زہرہ آج ہو جاتا

تجھ آنکھوں سے لہتر کر دینے کرنا شور کیا کرتا  
 یہ شیشہ طاق سے گر کر نہ ہوتا چور کیا کرتا

جو اپنا پھوڑتا تھا سرد آواز چینی پر  
 اگر سنا دلوں کے ٹوٹنے کا شور کیا کرتا

نہ ہو وہ کیونکہ سرمہ جس کو دی ہو حق نے بنی  
 تجلی دیکھ کر پستا نہ کوہِ طور کیا کرتا

لگی ہو سب خدائی، نفی و اثبات پر اپنے  
 موحد دیکھ کر اس وقت کے منصور کیا کرتا

مواجل کر شب بھراں میں آگے صبح ہونے سے  
 یقین کے داغ پر یہ مہم کا فور کیا کرتا



مجھے گرجی تعالیٰ کا فرمائے جہاں کرتا  
خدا دیتا مجھے گرمیر سامانی خدا کی  
رہا میں نے خبر افسوس لذت سے اسیری کی  
نہ دیتا عیش کی خسرو کو فرصت قہر شیریں میں

بتوں کو میں نرورزان بکبوسوں پر مہرباں کرتا  
تو میں ان بلبلوں کو گلشنوں کا باغبان کرتا  
جو میں یہ جاننا کینج قفس میں آئیاں کرتا  
جو میں تو تا بجائے شیرے خونوں واں کرتا

کیا بھکولتھیں اس ناتوانی نے نخل ورنہ

گلی کو یار کی لو ہو سے اپنے گلستاں کرتا

اگر مرنے میں اس شوخ کی خاطر نشاں کرتا  
نہ ہوتا اس کی بد خوابی کا ڈر محکوتو پتھر پھر کر سب  
بجھتا قدر میرے ضعف پیری کی سب جن جب تو  
زباں فولاد کی ہو تبت جواب کو کہن یوسے

خدا جانے وفا میری کے حق میں کہاں کرتا  
گلی میں یار کی راتوں کو فریاد و نغاں کرتا  
جو تجھ سا کوئی تیرے تیرے قد کو کہاں کرتا  
ستم ہوتا اگر یہ وزیر کو عشق امتحاں کرتا

نہ آیا سرفروا بدھریں کے فکرِ عالی کا

زمینوں کو دگر نہ رہتے تھے کی آسماں کرتا

نہ آب تیشہ فرہا اپنے خون میں گریلا سکتا  
اجل تھی کو کہن کی وہ جو صورت بانڈھنی  
یہ عشق سرشکن فرہا د پر لایا جو کچھ لایا  
اجل نے کو کہن کی خوب کھلی ترم خسرو کی  
اگر تیشہ نہ کرتا دستگیری ان بچارے کی

اس آب زنگ سے کب نقش شیریں کو بنا سکتا  
دگر نہ یہ خبر کوئی بھی دشمن کو سنا سکتا  
دگر نہ کون ایسی فتح خسرو کو دلا سکتا  
دگر نہ اس کے سنگ ویر کو یہ کب اٹھا سکتا  
یقیناً فرہا د تیغ کوہ کے کب منہ پہ آسکتا

یہ دل سیا خراب کچھ وہ بازار کیوں ہوتا  
 تیری الفت سے مرنا خوش نہیں آتا مجھے ورنہ  
 حقیقت میں یہ سعلہ عشق کا ہی برگ گل ورنہ  
 کسو کا بھی کبھور اکھا کرودن تم کو لازم ہے  
 اگر ملتا نہ اتنا گلرخوں سے خواہ کیوں ہوتا  
 یہ اتنا کارِ آساں اس قدر شوار کیوں ہوتا  
 خلیل اللہ پر آشکدہ گلزار کیوں ہوتا  
 وگرنہ دلِ رباؤں کا لقب لدار کیوں ہوتا  
 یقیناً امید جینے کی نہیں تیری ان آنکھوں سے  
 اگر پہنرتو کرتا تو یوں میسار کیوں ہوتا

کبھو یہ تھا کہ ہم پر وہ بت مغرور رو دیتا  
 تیری زلفوں سے دل شیون میں ایسا ہی کہ گرتا  
 ہمیشہ کھینچتا ہوں اشکِ خوں کو دارِ مرگان  
 تیری جاگہ اگر تھپڑ بھی ہوتا، آب ہو جاتا  
 بڑا جب دیکھتا حالِ دلِ رنجور رو دیتا  
 صد اس چینی مودار کی، فغفور رو دیتا  
 اگر سولی مہری کو دیکھتا منصور، رو دیتا  
 پھٹی چھاتی کو میری دیکھ کوہِ طوز رو دیتا  
 سحر کے چاک پر روتا ہی جوں شبنم لہیں میرا  
 جراثیم دیکھتا گر مرہم کا فوز رو دیتا

نہیں معلوم اب کی سال میخانہ پہ کیا گزرا  
 برہن سر کو اپنے پھیلتا تھا دیر کے آگے  
 مجھے زنجیر کر رکھا ہی ان شہری غزالوں نے  
 ہوئے ہیں جوڑ میرے ستخوان تھڑوں سے لڑکوں کے  
 ہمارے توبہ کر لینے سے پیمانہ پہ کیا گزرا  
 خدا جانے تری صورت سے بت خانہ پہ کیا گزرا  
 نہیں معلوم میرے بعدیرانہ پہ کیا گزرا  
 نہ پوچھا یہ کبھی تو نے کہ دیوانہ پہ کیا گزرا  
 کہاں ہی سمع کو پروا کہ پروا نہ پہ کیا گزرا

ہر تکے داغ سے تر سینہ سوزاں میرا  
 عم کے ہاتھوں نہ رہا کچھ بھی رفو کے قابل  
 آہ زنگ آگ سے رکھتا ہر گلستاں میرا  
 موج دریا کی طرح ضبط میں آسکتا نہیں  
 کوئی کیوں کر کے احوال پریشاں میرا  
 رو اگر دیکھے اس کو بھی تو کچھ عیب نہیں  
 آئینہ سے بھی گیا کیا دل حیراں میرا؟

میں تو ظاہر نہ کروں اس کی جفا کو لیکن

چھپکے کیوں کہ لقصین نہ خم نمایاں میرا

نہ ہو جو دور میرے سر سے نکل عافیت عم کا  
 خداوندی کی چاہی ہے خلافت حق تعالیٰ نے  
 نہ پڑو داغ پر میرے اکھی ساریہ مرہم کا  
 کوئی مطلب نہیں پایا ہے یہاں آنے سے دم کا  
 ارے واعظ ہمارے پاس ہے آتش محبت کی  
 سبھی مرتے ہیں شوقِ شوقی پر جی دیتے ہیں شادی  
 کہ جس کو دیکھ زہرہ آب ہو جاوے جہنم کا  
 تکلف بر طرف یہ نوحہ گر نہ رہے مام کا

شکوہ حسن سے آنسو ہمارے سوکھ جاتے ہیں

لقصین، سورج کے آگے کب اثر رہتا ہے جہنم کا

ہیں نہ خم میرے کاری اس سینے سے کیا ہوگا  
 اس کم نگہی سے کب بگھتی ہے عطش دل کی  
 اب فرما ہی اہتر ہے اس جینے سے کیا ہوگا  
 ساتی مجھے اتنی سی نے پینے سے کیا ہوگا  
 کہتے ہیں کہ تسخیر آئینہ کو آتی ہیں  
 مستوں کا عباہ دل کچھ مے نے نہیں چھوڑا  
 زابہ گزرا اب تو بھی اس کینے سے کیا ہوگا  
 دنیا کے لقصین، تھکے گنجنے سے کیا ہوگا  
 جبیں کے خزانے ہوں بت کام چلے تیرا

گریباں بہاڑ ڈالے رشک سے ہر گلبدن اپنا  
 لیکھا ہاتھ پتھر اس طرح کی سعی ناحق سے  
 دیارِ باور از عشق اس چاک گریباں سے  
 ہما جی نکل جاتا ہے جب یہ نوجواں ہم کو

یقین، اس کے دردناں کی باتیں جو کیا جاتے

صدق کی طرح دھوئے آب گہ ہر سے دہن اپنا

تنگ دل کو کب بھلی لگتی ہے بتاں کی ہوا  
 لذتیں ساری گرفتاری کی جاتی ہیں بباد  
 نہیں آتر سکتی کسی افسوں سے کالے کی لہر  
 کیوں نہ ہو تر داموں کو شست شوگی آرزو

ہر گھڑی صحرائستنی میں نہ کر حرارت یقین

آگنی تھی رہ اس محزون گریباں کی ہوا

سر پر سلطنت سے آستانِ یار بہتر تھا  
 مجھے دکھ پھر دیا تو نے مندا کر سبزہ خط کو  
 مجھے زنجیر کرنا کیا مناسب تھا بہاراں میں  
 ہوں نے ہجر سے کچھ وصل میں دھڑکے بہت کچھے  
 ہر نخل ہما سے سایہ دیوار بہتر تھا  
 جرات کو مرنے وہ مرہم زنگار بہتر تھا  
 کہ گل ہاتھوں میں اور پاؤں میں میرے خاتمہ تھا  
 ہمارے حق میں اس راحت سے وہ آزار بہتر تھا  
 یقین پر ہیزا اگر کرتا تو یہ بیمار بہتر تھا  
 مبروں مر گیا جس دن کہ نظارہ سے باز آیا

اتنا کوئی جہاں میں کھو بے وفانہ تھا  
 اگلے میں دل کی آنکھ سے اتنا گرا نہ تھا  
 ملنے ہی میرے مجھ سے یہ دل آشنا نہ تھا  
 معذور رکھ تو مجھ کو مراد ل بجا نہ تھا  
 ماضی جو یہ نصیحت بیجا نہ میں سنی  
 مرنے کی طرح میں نے جو یہ اختیار کی  
 دیکھا تو زندگی میں فرا کچھ رہا نہ تھا

جو کچھ کہیں یہ تجھ کو لیتیں ہے سزا تری  
 بندہ جو تو توں کا ہوا کیا خدا نہ تھا؟

اس قدر غرق لہو میں یہ دل زار نہ تھا  
 حسن کا جذب زلیختا سنی کچھ چل نہ سکا  
 جب جنا سے ترے پاؤں کو سرکار نہ تھا  
 ورنہ یہ پاک گھر قابل بازار نہ تھا  
 دل میں اہد کے جو جنت کی ہوا کی ہو  
 کو چہ پار میں کیا سایہ دیوار نہ تھا  
 دل مرا عشق کے دھڑکوں سے موا جاتا ہو  
 یہ وہ دل ہے کہ کوئی ایسا جگر دار نہ تھا

”آپے کیوں نہ موا کہہ کے لیتیں کو مارا  
 رہت پوچھو تو کوئی مجھ سا گنہگار نہ تھا

نہ تھا یہ وادی امن یہ کوہ طور نہ تھا  
 کہوں میں کیونکہ نہ صبح بہار تجھ کو کہ آج  
 نرا تو ہی تھا تجلی کا واں ظہور نہ تھا  
 چمن میں تو جو نہ تھا گل کے منہ پہ نور نہ تھا  
 خیف مجھ سے ابچھ کر عبت ہوا واعظ  
 کہ میں تو مست تھا کیا اس کو بھی شعور نہ تھا  
 تری جدائی میں کیا جفا اٹھایا ہوں  
 مرے جو پاس تو آتا وفا سے دور نہ تھا  
 مرا جو کام وفا تھا سو ہو سکا نہ لیتیں  
 وگرنہ اس کی جہا میں تو کچھ تصور نہ تھا

اس گل سے کچھ حجاب ہمیں درمیان نہ تھا  
دام و قفس سے چھوٹ کے چھنچے جو باغ تک  
جس دن کہ یہ بہار نہ تھی گلستاں نہ تھا  
دیکھا تو اس نے میں میں چمن گانستاں نہ تھا  
دنیا میں اور کوئی سجیلا جو اس نہ تھا  
اے بلبلوں چمن میں مگر باعباں نہ تھا

لاچار لے دل اپنا گیا گور میں یقین

اس خنک جہاں میں کوئی قدر داں نہ تھا

گرا میں آنکھ سے تیرے۔ جہاں کے ہاتھ کیا آیا  
مرے ان آنسوؤں نے کھو دیا نورِ میرا  
دماغِ گل دھوئیں سے خارِ خس کے کر دیا ناخوش  
نہ کہتی رازِ دل تو اتنی رسوائی بھلا سہتی  
مجھے پکار میں پر آسماں کے ہاتھ کیا آیا  
یہ یوسف بیچ کر اس کارواں کے ہاتھ کیا آیا  
جلا کر آتیاں کو باعباں کے ہاتھ کیا آیا  
فیضت کے مچھو اس زبان کے ہاتھ کیا آیا

یہ بیمار آپ مرجاتا۔ جو جلتا ان کے کام آتا

یقین کو مار کر زور آوراں کے ہاتھ کیا آیا

اس کو جب خشم و رضا میں برابر ہو گیا  
دلبروں کے نقشِ پاپ میں ہر صدف کا سا اثر  
کیا بدن ہو گا کہ جس کے کھولتے جامہ کا بند  
حیف مضمون روٹھنے کا پھر مگر ہو گیا  
جو میرا آنسو گرا اس میں سوگو ہر ہو گیا  
برگِ گل کی طرح ہر ناخن معطر ہو گیا

اے مسخفی کے تذکرہ میں یہ مطلع اس طرح ہے :

جس مسلمان نے اُسے دیکھا وہ کافر ہو گیا

کارہیز اس بیت کے ہاتھوں ہائے ابر ہو گیا

اچے جب نہ تھا واقف کہاں تھا یہ شکوہ دیکھتے ہی آئینہ میں منہ سکند ہو گیا

آنکھ سے نکلے یہ آنسو کا خدا حافظ نصیب

گھر سے جو باہر گیا لڑکا سوا بتر ہو گیا

## ردیف (ب)

گر نہ ہوتا آشیانِ مہلِ عمکیں خراب  
کر سکتا باغ کو لے باغبان گلچیں خراب  
کیا گرا دی ایک تیشہ سے بنا فرہاد کی  
کر دیا کس گھر بسی نے خانہ شیریں خراب  
کس کے آگے جا کے سر پھوپھ کر دیتا ہی آہ  
خاطروں کے تیشہ خانے وہ دل سنگیں خراب  
صبر کیجئے کب تک ناصح کہہ کر دیتا ہی عشق  
حوصلہ کا شہر غارت خانہ تمکیں خراب

پاؤں کو اپنے نصیب کے چشم گریں پر نہ رکھ

مت کر لے گل آج جو میں دامن نگیں خراب

ہر بتوں کا کبر اور یہ نازِ استغنا، ادب  
بد نما لگتا ہی جو کرتے ہیں یہ بیجا ادب  
عشق کا ہی حسن کی گردن پہ حق تربیت  
تب تو کرتے ہیں مہرا خوبان بے پروا ادب  
نوک بعضے سر کی ہوتی ہی جو خم اس سے چھ  
عالم بالاسے آتا ہی حلا، گویا، ادب  
میںہ بھی کھل جاتا ہی اور ندیاں اتر جاتی ہیں،  
چشم تر کا کرتے ہیں کیا ابر، کیا دریا، ادب

دشت اٹھا ہی تو اضع کو نہیں یہ گرد باد

دیکھ دیوانوں کا کرتا ہی نصیب صحرا ادب

## رویف (ت)

تیری آنکھوں کی کیفیت کو منخانے سے کیا نسبت  
نگہ کی گردشوں کو دوپینے سے کیا نسبت  
جیسے بحر میں وہ وصل میں بھی جی نہیں سکتا  
تکلف برطرف نہیں کو پروانے سے کیا نسبت  
یہ ہوتی ہیں جن کی سپیاں آنکھیں ہیں عاشق کی  
مرے آنسو کو مردار بد کے دانے سے کیا نسبت  
ارے دل مت توقع دلبروں سے رکھو رحم کی  
لہو پیتے ہیں جو شخص ان کو غم کھانے سے کیا نسبت

گل اس کا داغ ہی اور سرو اس کا، آہ موزوں تو  
یقین سے نوحہ گر کو باغ میں جانے سے کیا نسبت

جہاں دل گم ہوئے، وہاں کون جاسکتا ہی، کیا قدرت  
خبر ان یوسفوں کی کون لاسکتا ہی، کیا قدرت  
یہ جس نے بت تراشے ہیں وہی سمجھا، بغیر اس کے  
کہیں یہ صورتیں کوئی بنا سکتا ہی، کیا قدرت  
توں کی مجھے خاطر جمع ہو، بیان تک کہ کہتے ہیں  
کہاں اس دام سے یہ صید جاسکتا ہی، کیا قدرت  
ہمارے شور سن، جنوں کو بھولی طرز نالہ کی  
کوئی شیروں کے منہ پر نے جاسکتا ہی، کیا قدرت

یقین، تائید حق سے شعر کے میدان کا رستم ہی  
مقابل آج اس کے کون آسکتا ہی، کیا قدرت

## رویف (ث)

ہوا دیوانگی میری کا وہ گل پرین باغ  
کہ ہوتا ہی جنوں کے شور کو سیرِ چمن باغ



تصور کر کے لیتا ہوں مزا میں اس کی باتوں کا  
 محبت کا نہیں ہے ظلم بھی خالی عدالت سے  
 توجہ سرد کی سے، قمریوں کا نالہ موزوں ہے  
 سبھی گشتگو میری کاہی، میرا سجن با عث  
 مے اس ام میں پھنسے کاہی وہ منہرن با عث  
 خوش آتی کب ہے قیدِ زندگی جھکو نصیب، لیکن  
 مے اس ام میں پھنسے کاہی وہ منہرن با عث

## ردیف (ج)

کر سکے کیا عقل میرے غم کے جانے کا علاج  
 زنگ گل کی آگ پر دامن نہ مار۔ اے بادِ صبح  
 حق کو کپٹے۔ نہ بانڈھے جبک ان لوگوں سے دل  
 گر طہارت چاہتا ہے تو۔ خدا کے واسطے  
 کام کب آتا ہے دیوانوں کو سیانے کا علاج  
 کیا کر نیگی بلبلیں پھر آشیانے کا علاج  
 کیوں کہ ہونے نخرین۔ ایسے دیوانے کا علاج  
 کاٹ سر۔ لوہو سے اپنے کرتھانے کا علاج  
 شیشہ دل کے تیس اپنے سنبھالے رکھ لھتیں  
 پھر کرے گا کون اس کے ٹوٹ جانے کا علاج

## ردیف (ج)

پھر کوئی سلسلہ جہان ہو ازندان کے بیچ  
 زخمِ دل تو نے دے ناسور۔ نہ کر اس کا علاج  
 آج زنجیر سے آتی ہے جہنک کان کے بیچ  
 درد میں جو کہ فراہی نہیں دمان کے بیچ

میں یوانہ ہوں تیرا مجھ کو نہ مارے۔ اے ظالم  
 سامنے ہوتے ہی پھر لاش نہ پائی دل کی  
 قتل مخبوں کا پڑھا ہی کہیں قرآن کے پنج  
 بٹ گیا نوکِ سناں پر صفِ مرگان کے پنج  
 جیسے پہتا ہی یقیں مارنے رنگیں جامہ  
 شور ہی غل ہی قیامت ہی گلستان کے پنج

## ردیف (ح)

روٹھ کر دل سامنے خواہاں کے جاوے کس طرح  
 باغباں بے رحم اور در بند۔ دیواریں بلند  
 پھٹ گیا جی اس کا اب آنکھیں ملاوے کس طرح  
 بس بے بال و پر گلشن میں جاوے کس طرح  
 ہاتھ سستی جا چکا جب بار تباہی ہمسار  
 پی کے مے تنہا کوئی دھو میں محاوے کس طرح  
 رنگ سے ہندی کے ہو جاتے ہیں آنسو لعل تر  
 رکھ کے ان پاؤں پہ کوئی سر اٹھاوے کس طرح

اختیاری ہو مگر یہ کام ناصح تو ہی کہہ  
 عشق سے کوئی یقیں کو باز لاوے کس طرح

خار سے مرگان کے جی ڈرنا ہی میرا بے طرح  
 خانماں آنکھوں کا کوئی بل میں جاتا ہی خراب  
 رکھ مہری آنکھوں پہ پیتے ہو کفِ پابے طرح  
 آنسوؤں کا جوش میں آیا ہو دریا بے طرح  
 بولنے تیرے سے جی اٹھتے ہیں جن میں جی نہیں  
 پھر مروج ہو چلا دین مسجا بے طرح  
 خوب رو حق میں مسرے بد خو کل جاتے ہیں آہ  
 گیا غلط کرتے ہیں میرے چشمِ بینا بے طرح  
 فصل گل بھی آن چپی دیکھتے کیا ہو یقیں  
 اب کے چلتا ہی جنوں پر دل ہمارا بے طرح

ہو جگے، دل، گریباں بھاڑ دیوانے کی طرح  
 چوڑ والا کوہن سائل یوں تھرے ہائے  
 زلف کی زنجیریں آخر پھینسا، شانے کی طرح  
 کس سے سکھی تھی یہ شیریں کام فرمانے کی طرح  
 عاشق اور معشوق عالم کی سند کرتے ہیں سب  
 تجھ سے خونخواری کی طرز اور مجھ سے نم کھانے کی طرح  
 ہی نکل جاتا ہی میرا جب کبھی آتی ہی یاد  
 وہ قسم کھا کر اسی ساعت مگر جانے کی طرح  
 گر لقیں تو چاہتا ہی، یار ہو شمع فرار  
 گود جا، گر، آتش سوزاں میں پروانے کی طرح

## ردیف (ح)

نہ میرے چاک گریباں سے ہر زوگستاخ  
 نہ میرے زخم سے مہم کی آرزوگستاخ  
 رہے ہر آئینہ بے طرح نکتہ چینی حسن  
 نہ کر تو اس کو اب اتنا بھی دبر وگستاخ  
 نے ادب سے جنوں کو گیا ہوں اتنا بھول  
 کہ ہاتھ جیب سے گویا نہ تھا کبھوگستاخ  
 میں اس لیری سے پتیا ہوں خون دل اپنا  
 کہ جوں شراب کے پینے میں ہر سبوگستاخ  
 ہزار شکر لقیں میں گر چہوں بے قدر  
 نہیں ہر مجھستی ہرگز وہ تند خوگستاخ

## ردیف (د)

دے تیری نگہ بن جان، اشکِ خوش کی درد  
 غیر شیریں کون دے سکتا ہی اس گلگوں کی درد

چاہتا تھا میں کہ سارا غم ہو میرے نصیب  
 ڈھونڈتی پھرتی تھی دیوانے کو اپنے روز و شب  
 آہ! غم نے بھی نہ دی اس خاطر محزون کی داد  
 دلبری وہ تھی جو لیلیٰ کے گئی محزون کی داد  
 اب تک ویراں ٹپا ہے یہ جنوں کا پایہ تخت  
 پھر کسی نے بعد جنوں کے نہ دی ہاموں کی داد

کون رہے مجھے قامتِ رعنا پہ کیے جز لقمیں  
 غیر ساع کون دے اس مصرعِ موزوں کی داد

## ردیف (د)

کیا خزاں نے کر دیا ویراں گلستاں العیاذ  
 لوگ اسی دوی میں اب کہتے ہیں آہو کاشکا  
 کس طرح سے بلبلیں بھرتی ہیں نالاں العیاذ  
 بعد جنوں لوں ہوئے سیکس غزالاں العیاذ  
 آہ، یہ عقدِ گہر لویں ہو پریشاں العیاذ  
 کس قدر یہ سنگدل ہوتے ہیں خواباں العیاذ  
 بات کہتے ڈالتے ہیں پھوڑ یہ شیشہ سادل

چاک کر ڈالا ہے تو نے اپنا سینہ بھی لقمیں  
 پھاڑتا نہیں اس قدر کوئی گریباں العیاذ

## ردیف (د)

دل میں کہہ کر چلا تھا اپنے جانے کی خبر  
 بلبلیں پیہم چلی جاتی ہیں باغوں کی طرف  
 پھر نہ دی ہم کو کسو نے اُس دیوانے کی خبر  
 کچھ تو اڑتی سی سنی ہو گل کے آنے کی خبر

سچ کہو لے بلبلوں کس باغ سے آتی ہوں  
ہی ہمارے بھی تمہیں کچھ آشیانے کی خبر  
نہیں ٹھنچتا ضعف سے نالہ مرصیاد تک  
کون لے اس ناتواں کے آج دانے کی خبر

باغیاں کو جان کر مانع نہیں ہوتا یقیں  
ورنہ سب گل کو بلبل کے ستانے کی خبر

کون جانے بن تیری آنکھوں کے چشم تر کی قدر  
بوجھتے ہیں مرموم بنیا ہی اس گوہر کی قدر  
جاننا تھا کوہن شیریں کی دل سخی کا لطف  
جس کو ہوسر مھوڑا جاتے وہ ہی تپھر کی قدر  
اب جو اڑ بٹھیں نفس کے بام پر مقدوریاں  
حیف ہم آگے نہ بوجھے اپنے بان و پر کی قدر  
بوجھتا ہوں اے سخن تیری نگہ کے پیچ و تاب  
جز بمصر کون جانے تیغ کے جوہر کی قدر

مجھ سے تپھر کو کیا ہے جوں نگیں حرف آشنا

کون پہچانے یقیں بن حضرت منظر کی قدر

توقع دے کے مت کہ نہ امید کی سخن لیں کہ  
جو اب تلخ مت دے مھکوائے شیریں دہن لیں کہ  
پھٹک کر جی نکل جاوے گا بلبل کی طرح میرا  
کھلا بند گریباں کو نہ رکھ لے گلبدن لیں کہ  
ہوئی ہیرا کہ تیرے شعلہ آواز باقی ہے  
مت اتنا بھی جلا قمری کو لے سرو چین لیں کہ  
جو لوہا جس نہ دے اس کو لگانا ہاتھ کیا حاصل  
بہت کی تو نے اس تشبہ کی خدمت کوہن لیں کہ

بہارا آخر ہوئی جواب تو سینے دے گریباں کو

یقیں کہتا ہی کوئی اس قدر دیوانہ پن لیں کہ

گریباں بھاڑتے ہیں دیکھ خوبان چین کیوں کہ  
نہ کیجئے چاک ناصح اس سوچ میں پیرین کیوں کہ

کرے محنت کوئی لذت اٹھاوے یا رے کوئی کہو اپنے تئیں ضائع نہ کرنا کو کہیں کہیں کر  
 نہ دوے گلرخاں تکلیف محکومہ شعر خوانی کی کہو بن فصل گل کوئی کہے دیوانہ بن کہیں کر  
 موا جاتا ہوں گے سایہ پہ پڑتی ہے نظر میری تیری سبج دیکھ کر احباب جلتے ہیں سبج کہیں کر

تعب سخت رہتا ہے لہیں اس بات کا محکومہ

کہ اتنا بولتے ہیں تلخ یہ شیریں دہن کہیں کر

گرچہ شیریں شیخ کے ہی وجود میں آنے کا شورہ  
 آہ و نالہ پر نہیں موقوف شہرت عشق کی  
 ہر طرف ہنگامہ ان آنکھوں کی مستی کا ہو گرام  
 یہ زیریں سیلاب سے ہوتی نہیں ہے چاک چاک

پر، قیامت بانگ ہوتا ہے منجانے کا شورہ  
 کس قدر ہے اس خموشی ساتھ پروانے کا شورہ  
 بھر رہا ہے جس طرح عالم میں پلانے کا شورہ  
 دشت کی چھاتی پھٹے ہوئے دیوانے کا شورہ

کیا جنوں کو بے طرح شورش میں لاتا ہے لہیں

فصل گل میں بلبلوں کے باغ میں جانے کا شورہ

کیا مری مرگان تر کے ابرنے ڈالا ہے شورہ  
 عشق کے آئین میں صورت کیونکہ بکڑے ان کا دی  
 خدمتوں میں بھی تجارت سے ہی زیادہ منفعت  
 خال گورے مکھ کا میرے دل کو لیتا ہے چرا

آج بادل بے طرح اٹھے ہیں یہ برسنگے زور  
 جو کہ جاتے ہیں طرف کعبہ کی بت خانے کو چھوڑ  
 رشوتوں میں تب تو لاکھوں دے کر لیتے ہیں  
 اس نگر میں چاندنی راتوں کو بھی پڑتے ہیں چوڑ

کس کا ماتم ہے لہیں جو اس طرح روتا ہے ابر

کو کئی ہیں کہ لہیں اور رشوریوں کرتے ہیں مور

شاخِ گل کو سرخ جوں شمشیر کرتی ہے بہار  
 قتل میں طبل کے کب تقصیر کرتی ہے بہار  
 کیا قیامت ہو کہ صفحہ پر چمن کے رات دن  
 کر بلا کا واقعہ تحریر کرتی ہے بہار  
 باغ کے کوچہ سے دیوانے نکل سکتے ہیں کب  
 رنگِ گل کی موج سے زنجیر کرتی ہے بہار  
 نشترِ نضاد کر رکھا ہے ہر پتے کے تئیں  
 اپنے دیوانوں کی کیا تدبیر کرتی ہے بہار

کیا چمن کی گل زمیں میں ظلم ہوتا ہے، لقصیں  
 خار کو گلبن کا دامنگیر کرتی ہے بہار

## ردیف (ر)

عقل گر رکھتا ہے بے موجبِ دانوں کو نہ چھوڑ  
 باغباں ان پہلوں کے آستانوں کو نہ چھوڑ  
 رنگ جوں بھرتا ہے نے میں اس طرح کی آگ سی  
 بھر رہی ہے اے ہما ان سخاؤں کو نہ چھوڑ  
 درو مندوں کے تو لیتا ہے عبتِ خون کا وبال  
 مر ہے یہ آپ یہ ان نا تو انوں کو نہ چھوڑ  
 ایک شہ تو یار کی گلیوں میں جانے دے ہمیں  
 اس قدر بھی پاساں بے خانانوں کو نہ چھوڑ

عشق کو ایامِ پری میں، لقصیں، موقوف رکھ  
 کیوں کچھرتا ہے بڑھاپے میں، جوانوں کو نہ چھوڑ

## ردیف (ر)

آگے لبوں کے ہونہ سکا خطِ یار سبز  
 ہوتا ہے کب شراب کے آگے خار سبز

تیری نگاہِ گرم سے دہکا ہی دل کا داغ  
گویا اڑا دیا ہے کسی نے جنا کے تیس  
ہوتا ہی جیسے آگ سے تخمِ شرارِ سبز  
ایسا ہوا ہی فیضِ ہوا سے عبا ر سبز  
کر لیں گے اشکِ سرخ ہمارا مزارِ سبز  
پر و انہیں ہی ابر کی اس مسشتِ خاک کو

موسم میں خط کے حُسن سے، امینِ نذرہ لقصیں

کرتے ہیں جامہ بر میں بوقتِ شکارِ سبز

خوش نہیں آتا ہی مجنوں بن بھی صحرانورد  
اب تک کرتا ہی تیشہ، کام میں پتھر کے دل  
ان غزالوں سے ہمارا دل نہیں لگتا ہنوز  
مانتا ہی کوہکن کے نقسش کو خارا ہنوز  
بھر رہا ہے سے معشوقی کے مینا ہنوز  
باوجود اس کے کہ ہی زخموں کے مارے خون میں  
آبِ خنجر کو ترستا ہی جگر میں ہنوز

ہی لقصیں کا عشق سے ہر موز بانِ صبا ج

اس پہ کم ہوتی نہیں اس کی وہ سنعنا ہنوز

بعد مرنے کے بھی ہوں گور میں غمناک ہنوز  
پی کے مستوں نے زمیں پر جو گرانی تھی شراب  
گرد پھرتے ہیں میری خاک کے افلاک ہنوز  
سبز ہوتا ہی اسی سے شجرِ تاک ہنوز  
ہو گیا پیر، گریباں ہی سرا چاک ہنوز  
چھوڑتا عشق نہیں مچھکو تو مانندِ سحر  
گرم ہی آتشِ سودا سے مری خاک ہنوز  
سبزہ لگنے کا نہیں مجھ پہ برس متالے ابر

گرچہ ہوں غرقِ بخوں عشق میں خواب کے لقصیں

لیک دامن ہی سرا گل کی طرح پاک ہنوز



# رذیف (س)

آج دیکھا ہوں میں اس لطف کی بیداد کہ بس  
 جی میں آتا ہی ترے قدر کو دکھا دیجے اُسے  
 ببلیں کیوں کہ گرفتار نہ ہوں اس سچ کی  
 کچھ پرواہ میں طاقت نہ رہی تبت چھوٹے  
 سر پر آیا مے اس طرح سے جلا د کہ بس  
 باغ میں اتنا کڑتا ہی یہ شمشاد کہ بس  
 اس طرح باغ میں پھرتا ہی یہ صیاد کہ بس  
 ہم تھے ایسے بڑے وقت میں آزاد کہ بس

تو نہ تھا حیف، نصیب ورنہ دوانہ ہوتا

آج اس طرح کا دیکھا ہے پریراد کہ بس

منہ پہ کھاتا ہے یہ اس طرح سے تلوار کہ بس  
 نزع میں دیکھ مجھے یار جھجک کر بولا  
 آپ کو بیچ کے یوسف نے زلیخا کو لیا  
 اس جھڑی سیتی کہیں گرنہ پڑے باہم فلک  
 دل مرا عشق میں ایسا ہی جگر دار کہ بس  
 کیا بڑی طرح سے مرنا ہی یہ بیمار کہ بس  
 کیا خریدار نے پایا ہی خریدار کہ بس  
 اس طرح رتے ہیں تجھ بن درد دیوار کہ بس

عشق کے دارِ شفا میں مجھے چل تو نصیب

کہ طبیعوں نے دیا اس قدر آزار کہ بس

آپ سے ہم نے مقرر کی ہی انہی جاقس  
 ہمصیروں کی جدائی سے ہی خاطر تنگ  
 کچھ نہ دیجیو دکھ مرے صیاد کو مرنے کے بعد  
 ورنہ ٹک پھر کہیں تو ہو جاوے تہ و بالا قفس  
 جھکو ہی اس دکھانی ساتھ، یہ صحرا قفس  
 قبر اور تابوت ہی کر لیجو میرا قفس

تنگ لڑ کر تباہ، پر ہم جو بھی جاتے ہے تو پڑا منہ دکھتارہ جائے گا تنہا نفس

اس گرفتاری کا پایا ہی مزاج سے لیتیں  
تب سستی یا دام خوش آتا ہی ہم کو یا نفس

## رویف رش

رات دن خوابوں کو ہر دہائے مفتوں کا تلاش  
روز و شب لبانی کو تھا دریش محضوں کا تلاش  
اشک رنگیں سے گلی تیری کو مشہد کر دیا  
مرگے ہیں دیکھ کر اس حشم پر خون کا تلاش  
جس طرح سے ڈھونڈتے ہیں لوگ، خاطر ہائے شاہ  
اس طرح رہتا ہی مجھ کو جانِ محزون کا تلاش  
جی سے میرے سانورے کی لگے ہی ہے جستجو  
جس طرح ہوتا ہی ایفونی کو ایفونیوں کا تلاش

شاعری ہر لفظ و معنی سے تری، لیکن لیتیں  
کون سمجھے، یہاں تو ہے ایہام مضمون کا تلاش

## رویف (ص)

مے جنوں پہ نہ تنہا کرے ہی مجنوں، قص  
کرے بگولے کی صورت بکڑکے، ہاموں قص  
یہ شاخ گل متحرک صبا سے نہیں، کہ چمن  
کرے ہی دیکھ کے تیری قبائے گلگوں قص  
تیرے ستم سے مزاجی یہ کچھ دھڑکتا نہیں  
خوشی سے قتل کے کرتی ہی جانِ محزون قص  
یہ گرد باؤ نہیں دشت میں کہ کرتی ہے  
میرے جنوں کے تہیں دیکھ روح مجنوں، قص

سخن کے سحرے، نزدیک ہی لقیں کہ کرے  
مری زمین غزل دیکھ کر یہ گردوں، رقص

## رولیف (ض)

کب سے زنجیر مجھ مجروح دیوانے کی عرض  
گر می اہل بزم سے مت کر کہ میں ہوتا ہوں واع  
نیشہ مجھ دل سانہ پاوے اور تیری آنکھوں سا جام  
دل کو دیراں مت کر، یہ ہے جنوں کا پایہ تخت  
نہیں بھنچتی کان تک اس زلف کے، شانے کی عرض  
شمع کی خدمت میں ہی اتنی ہی پروانے کی عرض  
اے اگر ساقی ہزاروں سال میخانے کی عرض  
اے پری زادوں کہ ہوسنے بھی دیوانے کی عرض

فصل جاتی ہے لقیں اور باغبان سے ایک بار  
کوئی کرتا نہیں ہمارے باغ میں جانے کی عرض

## رولیف (ط)

مت خدا کے واسطے کر دلیراں سے اختلاط  
سر و کتابی زبان حال سے تجھ قد کو دیکھ  
باغ ہی کا جنسے اس سے ہو گیا خانہ خراب  
تیرے عارض کا خیال اس دل سے لویں رکھتا ہی ربط  
کفری حق میں مسلمان کے بتاں سے اختلاط  
”کیونکہ کیجے ہائے اس عجا جو اس سے اختلاط“  
کیا ہے تب بلبلوں کو آیشاں سے اختلاط  
جیوں کہ آئینہ کو ہی آئینہ داں سے اختلاط  
ہی سخن کو جس طرح میری زباں سے اختلاط  
مخلط ہیں نالہ و فریاد مجھ دل سے لقیں

## ردیف زط

کیا قیامت ہی توں کی بزم میں جانے کا حظ  
ہم کو خدمت کا انھوں کو کام فرمانے کا حظ  
وصل میں بھی رد مندوں کو نہیں راحت نصیب  
دیکھ لیجے شمع کے ملنے سے پڑانے کا حظ  
اس طرف گل ٹوٹتا ہی اس طرف بلبل کا دل  
کیا رہا گلچیں کے ہاتھوں باغ میں جانے کا حظ  
جی نکلتا ہی میرا اس پر کہ کب آئے گا ہاتھ  
یار کے پاؤں پہ سر کو رکھ کے مرجانے کا حظ

بوجھتا ہی خوب کیفیت نظارہ کی لقیں  
اس نگاہِ مست سے لیتا ہی میخانے کا حظ

## ردیف رع

دن جنوں کے سہ پہنچے ہوشیاراں۔ الوداع  
فصل گل نزدیک آئی۔ اے گریباں۔ الوداع!  
میکدہ سے قصد کہہ کا کیا ہے، کیا کریں  
توبہ ہم سے ہو گئی اے مری پستان۔ الوداع  
نہیں ہیں فرصت کہ اب کے سال نازدھیں آشاں  
باغبان کا حکم یوں ہی اے گلستان۔ الوداع  
ہم سے تھا ویرانہ تک آباد، سو ہم بھی چلے  
اب خدا حافظ تمھارا، اے غزالاں۔ الوداع

نا توانی سے اسے جو روح جفا کی تاب نہیں

اب لقیں بوڑھا ہوا اے نوجوانان الوداع

رشتہ تیری لربانی کا رہیں کھاتی ہو شمع  
دیکھ تیرے حسن کے سقلہ کو جل جاتی ہو شمع

عاقبت تن پروری ہوتی ہے گردن کا وبال  
بے ججائی بسکہ شانِ حسن کے لائق نہیں  
اہلِ نور! آہنِ دلوں سے بسکہ تشریف تہ سبخت

کس قدر پہلوئے چرب سے دکھ ماتی ہے شمع  
بزم میں فانوس سے باہر نہیں آتی ہے شمع  
دیکھ کر گالگیر کی صورت کو کٹ جاتی ہے شمع

باد سے برہم نہیں ہوتا ہے یہ شعلہ، لقمیں  
بلکہ پروانہ کی گستاخی سے جھنجبائی ہے شمع

## رویت (ع)

بہ نہیں ہوتا کسی مرہم سے اس سینے کا داغ  
موت کا مرہم خدا جانے کہ کب آوے گا ہاتھ  
خاکساری محو کر ڈالے ہے سب دل کا عیار  
رشتک کی جاتی نہیں میرے دل پر خون سے خوب

ہو گیا ناسورِ آخری اور دیرینے کا داغ  
کیونکہ جاوے جان، تجھ بن جائے اس سینے کا داغ  
دور خاکستر سے ہی ہوتا ہے آئینے کا داغ  
جرأت ہے، مثلِ جرمِ لعل، اس سینے کا داغ

گور میں جاوے گا خیمانہ کی حسرت، لقمیں  
لے گیا ہمیشہ جوں عالم سے گنہنے کا داغ

ہم تو اب مڑتے ہیں اور بچتا ہے الفت کا چراغ  
آگ بھی بجھتی ہے اور سورج بھی ہوتا ہے غروب  
بے نگاہِ گرم، رہتا ہے میرا باطن سیاہ  
جانے کب میری یہ سرگرمی کسی کی سعی سے

دیکھئے کب ہووے روشن پھر محبت کا چراغ  
رات دن جلتا ہے جیساں داغِ حسرت کا چراغ  
حسن کا شعلہ ہے میرے دل کی خلوت کا چراغ  
کب حد کی باؤ سے بچتا ہے دولت کا چراغ

خاندانِ روم مجھ سے کیوں نہ ہو روشن لقمیں  
ہے میرا ہر داغ سینہ میں مصیبت کا چراغ

## ردیف (ف)

دل نہیں کھنچتا ہی بن مجنوں بیاباں کی طرف  
فصل گل کی ہم اسیروں کو خبر کب ہی ولے  
خوش نہیں آتا نظر کرنا غزالاں کی طرف  
ان دنوں میں شور سا کچھ ہی گلستاں کی طرف  
کیونکہ دیکھوں سیر اس خورشیدِ تاباں کی طرف  
دیکھ کر چھاتی بھری آتی ہی باروں کی طرف  
اس جو امیں رحم کر ساتی کہ بے جا مِ شراب

سحر کے ڈولے جو سنتے تھے سوا ب دیکھے لقمیں

دل کھنچا جاتا ہی اس زلف پریشاں کی طرف

آئینہ ہوتا ہی اس روتے درختاں کا حریف  
کون کر سکتا ہی پھر تسخیر ویرانہ کا ملک  
ماہِ بن اور کون ہو خورشیدِ تاباں کا حریف  
جب ہو مجنوں سا کوئی تب ہو بیاباں کا حریف  
عشق کے کعبہ کو جاتا ہی چلا یہ کارواں  
کون دے بن آہ میرے شورِ لبیں کا جواب  
ہو سکے کیونکہ جس دیہائے تالاں کا حریف  
کون ہو جز سینہ زخمی گلستاں کا حریف

سالہا سوزِ محبت کو چھپایا تھا۔ یہ لقمیں

ہاتھ آخر ہو گیا میرے گریباں کا حریف

ناصر سے مجھ کو غم نے کیا شرمسار حریف  
سوا ب اچھٹ چکا یہ گریباں ہزار حریف

رویا ہوں ہاں تک کہ اب آنکھوں میں نم نہیں  
کوئی بلبیل ان دنوں میں نہ پھسیو چنانچہ میں  
اس دکھ میں دیکھ مرگ بھی مجھ سے سرک گئی

بے آب ہو گئے گھر آب دار حیف  
جب تک کہ چھوٹوں ہو گئی آخر ہمار حیف  
کیا غم نے کر دیا مجھے زار و نزار حیف

جاتی نہیں وہ بے مرگی ہجر کی - یقیں  
کچھ وصل کے نشہ نے نہ کھو یا خار حیف

## ردیف (ق)

مے خوں سے تو اندیشہ نہ کر لے ہو وفا مطلق  
مجھے معذور رکھو - ہمصیفوں - تالہ کرنے سے  
ملوں کہو مگر نہ ان شیریں لبوں سے میں کہ دوری سے  
مرا ڈرتا ہر جی - آخر کو کیا ہوگا کسی دن سے

کہ ہوتا نہیں ہر قتلِ عاشقان میں خون بہا مطلق  
رہی نہیں اب زبانِ مسری فغان سے آشنا مطلق  
نہیں باپا مراد دل - زندگانی کا مرا مطلق  
میرے بیمار دل کو نہیں اثر کرتی وفا مطلق

نہ رہ ہرگز مقید مر بانی کی توقع کا

یقیں - اس قوم میں دیکھی نہیں ہم نے وفا مطلق

بہت جینے کی تدبیر اہل عرفاں کے نہیں لائق  
چمن میں دہر کے جی اس دلِ نالاکا نہیں لگتا  
عجب نہیں خوش نگاہاں کا - اگر دشوار ہو ملنا  
جھا کرنا - سخن - اہل وفا سے کیا مناسب ہے

کہ پتیا آپ حیواں - شانِ انساں کے نہیں لائق  
یہ خوش آواز بلبیل اس گلستاں کے نہیں لائق  
ہر ایک کا صید ہو جانا غزالاں کے نہیں لائق  
بھلوں سے بدسلوکی خوب رویاں کے نہیں لائق

جنوں کے ہاتھ سے محفوظ ایک دم رہ نہیں سکتا  
رفو کرنا یقین، میرے گریبان کے نہیں لائق

## رویف ک

زبیں، اس موم کے صوف میں ہر گشتگو نازک  
جو دنیا ہی میرے دل کا لہو پی، لیکن آہستہ  
عرق کرتا ہی اپنے حسن کے شعلہ کی گرمی سے  
لبوں پر زخم کے جی آ رہا ہی مت نکل جاوے

قلم میرے سخن کو چاہئے مانند مو، نازک  
خدا شاہد کہ شیشہ سے ہر زیادہ سبب نازک  
پسے ہر گل سی بھی، یہ دلبر خورشید رو نازک  
خدا کے واسطے، کی جو نہایت یہ رفو، نازک

اُن آنکھوں کی تگہ کا لطف پانا ہی یقین، مشکل  
کسی کو کیونکہ سمجھا دیں کہ ہرگز کسی کی بو، نازک

## رویف گ

اشک لاگی ہر پروانہ کے جیسی، تن کو آگ  
جلتے جلتے سے نمل ان تیلیاں کپڑوں کے ساتھ  
دل تیرے کو تازہ کرتا ہے ہمارا خون گرم  
فصل گل آتی ہی بلبل، آئیاں کا کر علاج  
چل یقین بہتر نہیں ہر اس سے جل مرنے کی طرح

لیگو، اے فانوس، ایسی تیرے پرہیز کو آگ  
جی دھڑکتا ہی مبادا، لگ اٹھے دہن کو آگ  
لال تر کرتی ہے جیسے پارہ آہن کو آگ  
لگ اٹھے گی اب کئی دن بیچ اس گلشن کو آگ  
کیا ہی پھولا ہی پلاس اور لگ ہی ہر بن کو آگ



# ردیف دل

تجھ کو کب چھوڑے گا ان حسرت پناہوں کا وبال  
ہم نہ کہتے تھے کہ مت چھوڑ ان دھواں دھاروں کے تیل  
ہو گیا یوسف کا دامن گیب چاہوں کا وبال  
ناصح اس دیوانہ آشفہ موسے مت ابھ  
خط کی صورت میں پڑا آخر نہ آہوں کا وبال  
اس تعافل ساتھ میرے سامنے سے مت گزر  
بے طرح پڑتا ہی حسرت کی نگاہوں کا وبال

بدگمان زاہد! یقین سے پاکبازاں پر نہ رکھ

دیکھ کیسے سر پر پڑے گاہے گناہوں کا وبال

رات دن دل کو لگا رہتا ہی خوباں کا خیال  
اور کے منہ دیکھنے کی کب ہی ان آنکھوں کو تاب  
بلبلوں سے چھوٹا کب سے گلستاں کا خیال  
ہاتھ گر لگتا زمانِ مصر کو یہ آفتاب  
سامنے ہو جن کے، اس خورشید تاباں کا خیال  
خواب جمع جاتا اٹھیں، اس ماہ کنگساں کا خیال  
سبستاں ہو رہا ہی آج اے ناصح دماغ  
کیونکہ جاوے سر سے اس زلف پریاں کا خیال

کیوں عبت سیتا ہی، اے ناصح، یقین کا چاک جیب

ہاتھ اس کا چھوڑتا کب ہی، گریباں کا خیال

اگر ہوتی نہ کافر باعباں سے آشنا بلبل  
چمن آباد ہو اور باعباں کا خانہ دیراں ہو  
تو اتنا گل کے نظارہ سے کیوں کرتی جیا بلبل  
نہ گل دیکھا نہ تالہ ہصفیروں کا سنا اس نے  
چلی گلزار سے آخر کو یہ کر کر دعا بلبل  
قفص میں کیوں پھرکتی ہی یہ بے برگ و نوا بلبل

زیارت باغ کی کرتی ہے، آنسو سے وضو کر کے جناب گل میں رکھتی ہے عجب صدق و صفا بلبل

جن میں باغبانوں کی لقمیں، کیا کیا اٹھاتی ہے

دفا یوں چاہیے! شاہ شہلبل امر حبابلبل!!

بچمن میں مجھ سے دیوانے کے لیجانے سے کیا حاصل  
دکھا کر گل جنوں کو شور میں لانے سے کیا حاصل  
جنھیں بالوں کی بھانسی دی، وہ ہرگز جی نہیں سکتے  
جو زلفوں میں بھنسا دا، اس کے غم کھانے سے کیا حاصل  
ہمارے درد کی دارو، اگر کچھ ہی، تو دارو ہے  
یہ بچھ سن کے، ساتی بات پی جانے سے کیا حاصل  
نگہ تیرے ہی جیسے عکس آئینہ کا چینی میں  
یہ سب باتیں سمجھ کر جان، ترمانے سے کیا حاصل

نہ وہ دل ہی نہ وہ شور جنوں ہے، سیر گل مت کر

رفیقوں بن، لقمیں، گلزار میں جانے سے کیا حاصل

قدرت را از بسکہ رکھتا ہے لٹک جوں شاخ گل  
بلد کے چلنے سے جاتا ہے لٹک جوں شاخ گل  
ہوں جھلے خوش کہ کرتی ہے تری شمشیر تیز  
نقشِ غم کو، صنوبرِ خاطر سے کٹ جوں شاخ گل  
ہارمت پہنا کر، اے پیارے، کہ نازک قدرت را  
بوجھ سے پھولوں کے کھاتا ہے لٹک جوں شاخ گل  
دفن کیو مجھ کو آہستہ، کہ میرے استخوان  
ہو رہے ہیں مارے زخموں کے تنک جوں شاخ گل

مرچکا ہوں تپہ جی میں مجھ دوڑنے کے، لقمیں

وہ خانی ہاتھ جاتے ہیں کٹک جوں شاخ گل

## رویف (م)

مے ہوئی آخر رہی تدبیر غم کی تا تمام  
 آبرودہی ہر دانوں نے جنوں کو اس قدر  
 پاؤں سے ستر تک پھینچتے مست ہوتی ہر نگاہ  
 انفعال و شرم کے مارے زمیں میں گر گیا  
 کس سے دل خالی کریں اب ہو چکا مینا تمام  
 گریہ محبوں سے دریا ہو گیا صحرا تمام  
 ہر عروج نشہ گویا وہ قد بالامت تمام  
 کو کہن کی نامرادی دیکھ کر خارا تمام

جب گیا ہر باغ میں خونی کفن ہو کر لقمیں

دیکھ اس کو مل گیا ہے خاک میں لالا تمام

پر گئی دل میں تم سے تشریف فرما نے میں دھوم  
 تیری آنکھوں نے نشہ میں اس طرح مارا ہر جوش  
 چاند کے پر تو سے جوں پانی میں ہو جلوہ کا حشر  
 ابر جیسے مست کو شورش میں لاوے دل کے بیج  
 باغ میں مچتی ہے جیسے فصل گل آنے میں دھوم  
 ڈالتے ہیں جس طرح بدست مینجانے میں دھوم  
 منہ تیرے کے عکس نے ڈالی ہے پانی میں دھوم  
 مچھلی ایک بار ان بابوں کے کھل جانے میں دھوم

بوائے مے آتی ہے منہ سے جوں کلی سے بوائے گل  
 کیوں لقمیں سے جان کرتے ہو جانے میں دھوم

## رویف (ن)

مصر میں حسن کی وہ گرمی بازار کہاں  
 جنس تو ہے یہ زلیخا سا خریدار کہاں

فیض ہوتا ہی نہیں پر۔ نہ مکاں پر نازل ہے وہ ہی طور، ولے شعلہ ویدار کہاں  
 عیش و راحت کے تلاشی ہیں سارے بیدر ایک ہم کو یہ ہی فکر، کہ آزار کہاں  
 عشق اگر کیجے دل کیجے کس سے خالی درد و غم کم نہیں اس دہریں غنچار کہاں  
 قیدی اس سلسلہ زلف کے، اب کم ہیں لقصیں  
 ہیں دل آزار بہت جان گرفتار کہاں

ہم تو حاضر ہیں، عشق یار کہاں خار و خس جمع ہیں شرار کہاں  
 باغبان رنہ بند کر، کہ دگر ہنر ہم کہاں، تو کہاں، بہار کہاں  
 سایہ تاک میں بڑا ہے زور لیک وہ سایہ پائدار کہاں  
 ہم ہیں مختار، کہتے ہیں باتاں جبر میں پھر یہ اختیار کہاں

موج میں آبِ زندگی کے لقصیں  
 فرزہ تیغِ آبِ دار کہاں

عمر آخر ہی جنوں کر لوں بہاراں پھر کہاں ہاتھت پکڑو مگر، یاروں، گریباں پھر کہاں  
 چشم تر پر گر نہیں کرتا، ہو اپر رحم کر دے ساقی ہم کوئے، یہ بہاراں پھر کہاں  
 یار جب پہنے جوان ہر گردے ارے دل، جی تثار جل چکے اے پروانے! یہ نگین حراغان پھر کہاں  
 اس طرح صیاد کب آزاد چھوڑے گا متھیں بلبلوں دھویں مچالو، یہ گلستاں پھر کہاں

ہر بہشتوں میں لقصیں سب کچھ وین دین نہیں  
 بھر کے دل رو لیجئے، یہ چشم گریباں پھر کہاں

کیونکہ ہوشاداب دے بن محبت کا چمن  
گلشنِ حسنِ سپاہی کی جھا ہے آبیار  
ہر امارت کس قدر بے رنگ بے جود و سخا  
ڈھب نہیں ہر خلق کی آنکھوں کو نظارہ کا  
سبز، اشکِ سرخ سے ہوتا ہے الفت کا چمن  
رنگِ خو خوار سی سی کپڑے ہر شجاعت کا چمن  
بن ترشح کیونکہ ہو سر سبز، دولت کا چمن  
بھر رہا ہے رنگ سے جلوہ کے قدرت کا چمن

سیر میں نے کی بہت باغِ تمنا کی، یقین

گل نہیں کھتا ہے غیر از داغ، حسرت کا چمن

بن چاک، سینہ پتھ مجت کی جا نہیں  
کعبہ بھی میں گیا، نہ گیا ان تہوں کا عشق  
ہیں سو سو التفات تغافل میں یار کے  
افت میں کس امید سے کیجئے داغ صرف  
جس گھر کا در کھلا نہیں، اس میں سوچا نہیں  
اس درد کی، خدا کے بھی گھر میں دوا نہیں  
بیگانگی سے اُس کے کوئی آشنا نہیں  
ان گلرخوں کی خاک میں لوبے وفا نہیں

شیریں دہن بھی، تلخ لگے بونے، یقین

اب چھوڑ دے نظارہ، کچھ اس میں فرما نہیں

ورد بن ہم کو، کچھ اس آگ سے مقصود نہیں  
ہم سے گرسرنہ نوا، اہل تکبر کا تو کیا  
ہر اسی تیغ کے زنگار کا مرہم درکار  
بت پرستی میں موجد نہ سنا ہو گا کبھو  
عشق پھیکا ہے اگر زخم، نمک سود نہیں  
فخر آدمی جو ابیس کا مسجود نہیں  
اور کسی طرح میسے زخم کا بہود نہیں  
کوئی تجھ بن میرا واللہ کہ معبود نہیں  
ظاہر، آتش سودا میں، یقین دہن نہیں

شکوہ جفا کا یار سے کرنا، وفا نہیں  
 ہر فصل گل زمینِ محبت میں ہے بہار  
 بندوں کو اعتراضِ خدا پر بجا نہیں  
 ہے نور کے حجاب یہ اسبابِ دنیوی  
 اس شہر سا جہاں میں کوئی خوش ہوا نہیں  
 کیوں چاہتے ہو میرے تپ عشق کا زوال  
 ہی فرشتے آفتاب جہاں پوریا نہیں  
 یہ درد خود دوا ہی، اسے پھر دوا نہیں

جو رستم کا ان سے تعجب نہ کر لیتیں

یہ سنگدل تباہ ہیں، کچھ آخر خدا نہیں

وہ کون دل ہی جہاں جلوہ گر وہ نور نہیں  
 کوئی شتاب خبر لو کہ بے نمک ہی بہار  
 اس آفتاب کا کس ذرہ میں ظہور نہیں  
 چمن کے بیج دیوانوں کا اب کے شور نہیں  
 صنم کدہ ہی نہ آخر یہ کوہِ طور نہیں  
 جو پھنچوں مرگ کے نزدیک میں، تو دور نہیں

کوئی بھی دیتا ہی لڑکوں کے ہاتھ شیشہ در

یقین میں غور سے دیکھا تو کچھ شور نہیں

تو نے ہم پر جو جفا کی ہی سوز کو ر نہیں  
 تجھ سے کیوں ہاتھ اٹھاؤنگا، ترے ہاتھوں  
 تپہ ہم نے جو وفا کی ہے سو منظور نہیں  
 جان سے عاشق اگر گزرے تو کچھ دور نہیں  
 وہ ظلمت کدہ جس سینہ میں ناسور نہیں  
 کون ناسور ہی جو شیش سے معمور نہیں  
 دین دیتا کے مجھے کام سے کھوتا ہی لیتیں  
 چھوڑ دوں عشق، یہ بات کہ مقدور نہیں

تیرے میں آج بتاں گا کوئی دمساز نہیں  
 ہم گئے کام سے مرغانِ چمن سے کہیو  
 تیری تصویر کوئی کیونکہ رکھے تیری جاگہ  
 خوش ہو کبنا، عشاق سے خواہاں کا داغ

یار کے قد کو نئے سرو سے تشبیہ لقمیں  
 سرکشی میں تو مسلم، اولے طناز نہیں

یہ سینہ عشق سے محروم دردِ داغ نہیں  
 مت احتلاط کرے نو بہار، اب ہم سے  
 یہ بلبلوں کا صبا، مشہدِ مقدر سہی  
 خدا کرے کہ یہ روشن ہے قیامت تک

گلی میں یار کی دل بھول جا پڑا تھا لقمیں  
 پھر آن نون سے دیوانہ کا کچھ سراغ نہیں

یہ ناخوشی سے بتاں کا مجھے خیال نہیں  
 ہمیشہ مجھ سے نئی جان چاہتا ہے سخن  
 خدا کرے، نہ گروں عشق کی میں نظروں سے  
 اصولِ عشق پہ تو لیں، تو زمرہ اس کا  
 لقمیں، چمن میں کچھ اس کا سبب نہیں معلوم  
 یہ کون ہٹ ہی تو اتنا بھی خرد دل نہیں  
 کسو کی چشمِ حقارت سے کچھ ملال نہیں  
 نہیں رست، جو بلبلیں شکستہ بال نہیں  
 کہ بلبلوں کا وہ ہنگامہ اب کے سال نہیں

بلائے عقل سے کچھ چھوٹے کی راہ نہیں  
بتاں خدا کی خدائی کے سبب مظاہر ہیں  
بغیر میکرہ یاروں! اکہیں نپاہ نہیں  
جو ان کا بندہ کہاوے، تو کچھ گناہ نہیں  
نہ کر مضائقہ گر تھکویں ستم کی ہوس  
نخل نہ کر مجھے، ہماں نہ ہو مرا لے عشق  
دیباہ عشق ہی، یہاں کوئی داو خواہ نہیں  
کہ میرے آنکھ میں آنسو، جگر میں آہ نہیں

جہاں کے بیچ کہیں آبرو نہیں اُس کو  
یقین، جو حضرت خواب کا خاکِ آہ نہیں

مجھ کو اب سیر و تماشائے شناسائی نہیں  
شوق کہتا ہی کپڑوں ڈر کر دامنِ یار  
تجھ بن، اے نورِ بصر کچھ مجھ میں مٹائی نہیں  
کیا کروں مستی سے کچھ ہاتھوں میں گہرائی نہیں  
جس محبت میں نہیں ہی شور، وہ بے نامک  
منفعل ہوں سخت جانی سے میں اپنی دل میں  
جس قدر تو سنگدل ہی اتنی میں سنائی نہیں

بن لقیں کے باغ میں جا کرتاں کہتے ہیں سب

سیر گل میں جی نہیں لگتا، وہ سودا کی نہیں

بھول جاتا باغ کے زیبا درگتوں کی پھین  
صدقہ جاتا ہی میرا دل بال بال اوپر تیرے  
دیکھتا اگر باغبان زخم نمایاں کی پھین  
دیکھتا ہوں جب تری لف پر شاں کی پھین  
ناصح، اس چاک گریباں پر تو کیجو اعتراض  
دیکھ کر پہلے تک ایک ان جانہ میاں کی پھین

اے بعض نسوں میں پھین کی جگہ تیرے لکھا گیا ہی ۱۲



ہائے میرا ہاتھ مت پکڑو کہ جب گل کی طرح چاک ہی کرنے میں ہر میے گریباں کی چین

ہی مسلم سڑکی بھی جامہ زیبی پر لقمیں  
کچھ کہی جاتی نہیں اس دورِ اماں کی چین

فیض میے داغ سے ہر خرد سالوں کے تئیں جس طرح خورشید نافع ہر نہالوں کے تئیں  
مت بھرا، ان اشکِ خوں کو، آنسوؤں سے غیر کے مت لڑا لڑکوں کی طرح، لے شوخ، ان لالوں کے تئیں  
ادھ موؤں پر ظلم کرنا، رحم کا کرنا ہے کام زندگانی مرگ ہر ان جینے والوں کے تئیں  
سڑ نہیں دل کے ملاتے، ہائے یہ مطرب پر بھول جانا چمے ان کے جیالوں کے تئیں

جب سے اس جنگل کو لہلی کر گئی وحشت لقمیں  
پھر نہ جمعیت سے دیکھا ان غزالوں کے تئیں

کم نہیں ہم بوجھتے کعبہ سے میخانے کے تئیں سجدہ ہم کرتے ہیں جوں خراب پانی کے تئیں  
ہر یہ دل، ناصح، بتاں کا جلوہ گاہ اس سے نہ بول تو رمت سنگِ جہا سے اس پر پچانے کے تئیں  
بحر میں جینے سے بہتر ہی ہلاکِ وزر وصل یہ طرح کیا خوب اس آبی ہی پر دانے کے تئیں  
لائے گئے کرتی ہی تعمیر دہائے خراب تا ابد رکھو خدا، معمور یہ میخانے کے تئیں

آٹھ گیا کہتے ہیں دیوانہ لقمیں دنیا سے ہائے  
ان نے کیا آباؤ کر رکھا تھا ویرانے کے تئیں

کوں کیوں نہ کریں قہر زلف سے چھٹنے کی تدبیریں پڑی ہیں میری ہر گشت میں جوں شانہ زنجیریں  
تماشا کر تصور کو، کہ ہر ایک اشک میں میرے تری صورت نظر آتی ہی جوں شیشہ میں تصویریں

ہمیں بھی بات کہہ آتی ہے، لیکن دل نہیں حاضر  
 دلوں پر برق سی گرتی تھی جب ہم نالہ کرتے تھے

جیسے درہو، ناصح، خورشیاں ساتھ تقریریں

گیس کبھی نظر نہیں معلوم ان آہوں کی تاثیریں

یقیناً اقبال ہاتھ آتا نہیں کچھ جی کے دینے کو

نہیں بونے کے ہم فرہاد، گر سوار سہ چریں

مرتا ہی یہ دیوانہ، اب کھول دو زنجیریں

ہیں بندگیاں، ان کے آئین میں تقصیریں

پر وزیر کو دیں اس فرہاد کا سر چریں

لڑکوں کو کتابوں سے منظور ہیں تصویریں

کرتا ہی کوئی یاروں اس وقت میں تدبیریں

ماتے ہیں تباہ ٹھوکر، گر پاؤں پہ سر رکھتے

اس عشق کے کشور میں یکساں ہو حق و باطل

ناواں ہنر معنی چھوڑ، صورت کی طرف چاہتے

چہرہ سے نکل کر موٹ پڑتے ہیں یقیناً منہ پر

اوراقِ طلائی پر جوں کھینچی ہیں تحریریں

گریباں آپرا ہی پھٹ کے گل کی طرح دہن میں

پڑا چین، اب لگی جب نگ گل سے آگ گلشن میں

کہ اس کا جی نکل جاوے گا، اس کی ایک ننگھن میں

کہ اور ہی دھن ہی درغانِ چین کی آج شیون میں

نہ گزرا ہو گا کوئی مجھ سارنگین باولے پن میں

پڑی کہتی تھی یوں بلبل، بہا آوے، بہا آوے

اگر رسم ہو عاشق، دم نہ مانے یار کے آگے

کوئی گلچہرہ خوش آہنگ اس گلشن سے گزرا ہے

یقیناً سے جلتے جلتے کی خبر کیا پوچھ کر، لوگ

پڑا ہو گا دیوانہ باولا سا کنج گلشن میں

عبث سے ہوا اس کو کیا رہا ہے گریباں میں

کوئی دن اور کرنے دو جنوں مچھو بہاراں میں

ہمیں نصرت کر اب لے باغبان گو بیوفانی ہو  
خزاں سے جی نہیں لگتا ہمارا اس گلستاں میں  
چمن کے بیچ کلیاتی ہو جیسے شاخ سبیل کی  
ہوئے ہیں اس قدر دل جمع اس زلف پرتاں میں  
جنوں کی سے سر تکب سر نہ میرا گرم ہونا صح  
لگی ہو آگ زنگ لالہ سے کوہ بیاباں میں

قیامت تک آہی زندہ رکھیہ نام مجنوں کا  
یقین کو دکھ کر کیا جی سا آتا ہے غزالاں میں

جب دکھتا ہوں تنہا تجھ کو سجن، چمن میں  
کس کس طرح کی باتیں آتی ہیں میرے من میں  
رٹ کے کھڑے ہیں عکس، تھرے پٹے ہیں سبکس  
دیوانہ ہائے جب سے جاتا رہا ہے بن میں  
مجنوں کی خوش نصیبی کرتی ہو داغ دل کو  
کیا عیش کر گیا ہو ظالم دیوانہ بن میں  
اس داغدار دل کو گاڑو نہ ساتھ میرے  
ڈرتا ہوں، مت لگے اٹھ آتش میرے کفن میں

خوبان، یقین کو معذوراں تو رکھو کہ اس کے

لو ہو نہیں جگر میں، آنسو نہیں نین میں

بہار آئی ہو ہم کو کیا کہے گا باغبان دکھیں  
چمن میں رہنے پاوے گا ہمارا آیشاں دکھیں  
اٹھا اس منہ سے لے باو صبا، گھونگٹ کے انجل کو  
توجہ سے تیری ہم بھی ٹک ایک گلستاں دکھیں  
ہر ایک نے راہ میں اس کی کیا ہے حتم کو گریاں  
کرے کس آب جو پر رحم، وہ سرور روان دکھیں  
پکاریں ان کو آؤ، اپنے باغوں کی خبر پوچھیں  
اُسی گلشن سے آتی ہیں چلی، یہ بلبلان دکھیں

یقین کے سر کو ٹھکرا کر، تاں اس میں کہتے ہیں

جے گا کب تک ان طرحوں سے ایسا ناتوان دکھیں

گالی بھی پی گئے ہیں۔ ماریں بھی کھائیاں ہیں  
 خسرہ کے منہ پر چڑھنا اور مہبتوں سے بھڑنا  
 ہم تو چلے ہیں، یارب، آباد رکھو ان کو  
 ایسا دراز دامن، نہیں ہاتھ ان کے آنا  
 ہم نے تیری جھانسیں کیا کیا اٹھائیاں ہیں  
 کچھ عاشقی نہیں، یہ زور آڑ مائیاں ہیں  
 ان باغچوں میں کیا کیا دھویں مچائیاں ہیں  
 بختوں میں عاشقوں کے کیا نارسائیاں ہیں

حق کو نقیص کے یاروں، برباد مت دو، آخر

تم نے سخن کی طرزیں اس سے اڑائیاں ہیں

دیوانہ مجھ سا کب جتیا ہے، کیوں بدبیر کرتے ہیں  
 ہوائے گرم کے لگنے سے کب تپھر چمکتا ہے  
 خدا کی بندگی کہنے اسے، یا عشق معشوقی  
 دیوانے ہیں یہ سیانے، چھوڑ دو تم نقیص کو ان کے  
 کوئی دن چلنے پھرنے دیں، عبت زنجیر کرتے ہیں  
 یہ نالے ان بتوں کے دل میں کب تپھر کرتے ہیں  
 یہ نسبت ایک ہی سو سو طرح تعبیر کرتے ہیں  
 پرانے گھر کی پر یوں کے تپھر کرتے ہیں

نگہ کرنے میں ان کے، کام ہوتا ہی تمام اس کا

یقین کے حق میں یہ خواباں بہت تقصیر کرتے ہیں

کیا فرہارنے جو کچھ، محبت اس کو کہتے ہیں  
 نہ کی تو نے نظر اس کی محبت پر نہ محنت پر  
 مئے گلزنک جس شیشہ سے جھلکے، معنی شوخی  
 چمن میں شاخ ہل جاتی ہے جیسے گل کے کھلنے سے  
 دیا جی بات کے کہنے میں، ہمت اس کو کہتے ہیں  
 ارے فرہاد کے قاتل، عدالت اس کو کہتے ہیں  
 نمایاں تیری صورت سے، صورت اس کو کہتے ہیں  
 لہک جاتا ہوں دم لیتے، نزاکت اس کو کہتے ہیں  
 بسبھوں سے شہ رخ سے آنکھیں کہ روت اس کو کہتے ہیں  
 یقین، اس تیری بدخواہی کا یہ نظارہ باہر

دوبارہ زندگی کرنا، مصیبت اس کو کہتے ہیں  
 پھر اٹھنا بے دماغوں کا، قیامت اس کو کہتے ہیں  
 ہوئی جا، یار شیریں کو کہن کے بعد خسرو کی  
 وہ کیا تھا زخمِ مہیشہ کا، جراثیم اس کو کہتے ہیں  
 مے گریباں و پڑوٹے قفس میں کیا ہوا، لیکن  
 گیا وہ ذوقِ سیرِ گل؟ جبارت اس کو کہتے ہیں  
 بمقدار جھائے یار، بڑھتی ہو وفا میری  
 کوئی چاہے تو آدیچھے، محبت اس کو کہتے ہیں

یقین، راکیا جرمِ محبت پر، زب سے طالع  
 شہادت اس کو کہتے ہیں سعادت اس کو کہتے ہیں

## رہیف (و)

نہیں ہوں منکرے، اہلِ میخانے سے کہدِ بچو  
 نہیں کی جی سے میں نے توبہ پیمانے سے کہدِ بچو  
 جو کرنا ہی تو اپنی فکر کر لے، نو بہار آئی  
 خدا کے واسطے یہ بات دیوانے سے کہدِ بچو  
 کوئی یہ چاند سا منہ چھوڑ کر عاشق ہو شعلہ کا  
 گزرا آتش پرستی سے یہ پرانے سے کہدِ بچو  
 رکھا ہی گھیر، ان شہری غزالوں کے سروں کو  
 پھنسا ہوں اب تو لہستی میں، یہ دیرانے سے کہدِ بچو

کیا سجدہ یقین نے، دیکھ اس محرابِ ابرو کو

برہمن تو رہا مسجد میں بت خانے سے کہدِ بچو

اسیرانِ قفس کی ناامیدی پر نظر کیجو  
 بہار آئے تو لے صیاد، امت ہم کو خبر کیجو  
 کیا ہر عشق ہم نے، تجھ سے ہمدم کے بھروسہ پہ  
 خدا کے واسطے، اے آہ، اس دل میں اثر کیجو  
 نہ کر شوخی، مبادا تاب کھائے مکر تیری  
 تک اس قد کی نزاکت پر نظر، اے موکر کیجو

کہا جاتا نہیں کچھ مجھ سے، جو تو کہہ کے کہیو میری اس بے زبانی پر نظر، اے نامہ میرا کیجو

لغیس سے جلتے جلتے کا سرتنا بھی نہ ٹھکراؤ

اس آتش سے ارے دامنِ رازوں، ٹھک خنجر کیجو

قامتِ رعنا سے تیرے بسکہ شرماتا ہے سرو دیکھ کر تجھ کو زمیں کے بیچ گر جاتا ہے سرو

تم ہمیں ماپاں یوں کرتے ہو، اے خوش قامتوں دیکھتے ہو، قمریوں کو سر پہ بٹھلاتا ہے سرو

قمریوں میں ذکر تیرے قد کا جب ہوتا ہے گرم ریچھ کر جوں نخلِ آتش قص میں آتا ہے سرو

باؤ سے ہٹتا نہیں ہے، بلکہ تیری چال دیکھ بسکہ چل سکتا نہیں خفت سے اکلا تا ہے سرو

باغ میں جیبا جاتا ہے لغیس، سایہ کی طرح

اس قدر سرکش کے آگے فرشتے ہو جاتا ہے سرو

جفا کے عذر میں اے ظالموں، نہ دیر کرو میری زباں کو شکایت پہ مت دیر کرو

حنا کی طرح میں اپنا بجل کیا ہوں، خون تباں شہید کرو خواہ دستگیر کرو

چھپا نہیں میرا اسلام اور تمہارا کفر فرنگِ چشم کا خواباں مجھے اسیر کرو

کہاں تک کوئی تنہا کیا کرنے فریاد اے بلبلوں، مجھے اپنا ہی ہمصفر کرو

خدا کرے کہ کہیں حق شباب ثابت ہو

مت امتحانِ وقایم لغیس کے دیر کرو

خونِ انصاف سے اتنی بھی زباں تر نہ کرو نعل کو یار کے ہونٹوں کے برابر نہ کرو

اس رخِ صاف کے آگے نہ رکھو آئینہ میں مگدڑ ہوں مجھے اور مگدڑ نہ کرو

جی نکل جائے گا عشاق کا بس کی طرح      گلر خاں، جامہ رنگیں کو معطر نہ کرو  
باندھ کر مجھ پہ کمر لطف نہیں، غیر کا قتل      اپنے بیداد کے مضموں کو مکر نہ کرو

سایہ بے شخص ٹھرتا نہیں، کتا ہی لقمیں

آپ سے جھکوجدا حضرت منظر نہ کرو

گرہ کھو بونہ زلفِ یار کی، نشانے کو مت چھڑو      چھو مت دل کی زنجیر ایسے دلو انے کو مت چھڑو  
کوئی ترکِ ادب کرتا ہی معبودوں کی خدمت میں      مسلمانوں، خدا سے ڈر کے بت خانے کو مت چھڑو

یہ محرابِ ناز بے خودی ہی زاہدو، سمجھو۔      خدا کے واسطے، مستوں کے پیمانے کو مت چھڑو

ابھی جاتا ہی جل، ایک دم تو جھینے دو بچارے کو      ٹپک ایک روشن کرو مت شمع پڑانے کو مت چھڑو

ستاؤ مت لقمیں کے دل کو، یہ خوبیاں کا مسکن ہے

خدا جانے کہ کیا ہوا اس پر ہی خانے کو مت چھڑو

قفس کے بیچ پھینے کا نہیں دیوانہ پن جھکو      نہ دو تکلیفِ شور، اے عندلیبانِ حمن جھکو

محبت کا فرا بگڑا نہیں گراس زمانہ میں      جواب تلخ کیوں دینے ہو، اے شیریں سر جھکو

نہیں کھلتا ہی تجھ بن غنچہ دل سیر گلشن سے      خس و خاشاک سے لگتے ہیں یہ سُر و تم جھکو

کوئی مجھے نہ بولو میں تو اب مرنے کو بٹھایا ہوں      خلافت دے گیا ہی خود کشی کی کوہن جھکو

لقمیں کے ساتھ اتنی بدگمانی، کیا قیامت ہے

اجازت عرض کی تو کیوں نہیں دیتا سخن جھکو

کھڑا ہی سرد نیٹ بن بنا کے رعنا ہو      جو یار پردے سے نکلے تو کیا تاشا ہو

نہ لانا تھا میرے گریہ کو شور پر اے عشق  
 یہ آرزو ہے مجھے دور چرخ سے پس مرگ  
 وہ ناخن ابروئے خوباں سے خوش نما تر ہے  
 کسو کے کام کی جس سے کوئی گروہ وا ہو

لہو لقیں کا جو پیتا ہے تو میں نہ رہتا ہوں

خدا کرے کہ تجھے یہ عذاب گوارا ہو

شہر میں تھا نہ ترے حسن کا یہ شور کبھو  
 عشق میں داد نہ چاہو کہ سنا ہم نے نہیں  
 فکر مرہم کا میرے واسطے مت کر، ناصح  
 گو نہ کرو وعدہ وفائے مجھے اس کا تو جواب  
 مصر اس خلیں سے اتنا نہ تھا معمور کبھو  
 عدل و انصاف کا اس ملک میں دستور کبھو  
 خوب ہوتا نہیں اس عشق کا ناسور کبھو  
 مجھ سے ملنا بھی سخن ہی تجھے منظور کبھو

اپنی بیدردمی کی سو گند ہی تھکوائے مرگ

تو نے دیکھا ہی لقیں سا کوئی رنجور کبھو

جو تو شراب پئے کیونکہ دل کباب نہ ہو  
 ننگ گزرتے ہیں ایام عشق ذراغ بغیر  
 دیوانے شہر سے یہاں آ کے چین پاتے ہیں  
 بتوں کی طرح نہیں حسن خلق و دامن پاک  
 نئے جب آگ کہاں تک یہ زہر آہٹ ہو  
 کہ سرد ہوئے ہوا جس دن آفتاب نہ ہو  
 خدا کرے، یہ خرابہ کبھو خراب نہ ہو  
 وہ کیا مزا ہے جو معشوق بد شراب نہ ہو

لقیں بتوں کا ہوا بندہ جسے ہی پر داغ

جو ہوئے کافر سے کس طرح عذاب نہ ہو



## رویف (۵)

لے کے دل کرتے ہوتا ہے دکھ کے ماروں کا گناہ  
 جان دینے میں کیا ہے ان بچاروں کا گناہ  
 اب تو ٹھیری ہے محبت جرم پر آخر کے تین  
 سخت یاد آوے گا پیکے جان تیاروں کا گناہ  
 جو نہ جی سکتے تھے بیانی سے وہ پھر کیا کریں  
 جی بھل جانے میں کیا ہے بے قراروں کا گناہ  
 جو نہ گزروں خون کے دعویٰ میں پانچا کروں  
 کون کر سکتا ہے ثابت ان پیاروں کا گناہ

عاشقوں پر جبر کرتے ہیں نصیب یہ خوب رو

کچھ نہیں اللہ ان بے اختیاروں کا گناہ

ضبط بہتری میسر کرنے ہوتا ہے سہراہ  
 یوں تو کرتا ہے جس کا دل بھی نالہ سربراہ  
 اس رخ تاباں کے ایدھر خط ادھر ہو ہا سہراہ  
 جوں سنہری آئینہ کے گرد تحریر سیاہ  
 ہو رہا ہے دل سرا بے ربط منصوبوں میں بند  
 جس طرح شطرنج کے پیادوں میں گھرجاتا ہے شاہ  
 عشق کے بھی کارخانے کی عدالت لیکھ لی  
 بوالہوس جہوں میں ہم اے محبت واہ واہ

کیونکہ نکلے بزمِ خواہاں سے کوئی جتیا نصیب

بے محابا کھینچ رہی ہے ہر طرف تیغِ نگاہ

خواب میں کس طرح دکھوں تھکے جو جوانی کے ساتھ  
 جمع آسائش کہاں ہوتی ہے بیانی کے ساتھ  
 کر دیا آنکھوں کے رونے نے مرے دل کو خشک  
 کب تک گم می کروں اس مردمِ آبی کے ساتھ  
 غنچہ رنگینی کو اپنی چاہیے، نہ کرے کھے  
 اس کو کیا نسبت ہے ان لہلہے عنابی کے ساتھ

پونچھے اس منہ کے ہو جاتا ہر سب گیس ویاں گل کہاں ہوتا ہے ایسے رنگ شادابی کے ساتھ

مفت نہیں لیتے وفا کو شہر خواہاں میں نفس

کس قدر بے قدر ہے جیسے، نایابی کے ساتھ

کہاں تاثیرِ نالہ میں، اے مرغِ نفسِ چہرہ عبت صیاد کو ناخوش بھی کہوں کرتا ہے لبِ چہرہ

کوئی آوارگی کو چھوڑ، کیونکر راہ پر آوے عبت تو شور و شر کرتا ہے اتنا اے جس چہرہ

گیا ہو گا نہ تو کیا یار کی گلیوں میں اتوں کو نئی تقصیر میں نے ہی نہیں کی اے جس چہرہ

کسو کا دستِ کوتاہ اس کے دامن تک کہاں پہنچے تمنا کی زباں مت کر دراز اے بولہوس چہرہ

یقین، یہ نالہ تیرا کیا بلا لے گا، ڈرتا ہوں

لگامت گھر کو اپنے آگ اے آتشِ نفسِ چہرہ

بہار آئی، ہمیں کیا حکم ہے، اے باغبانِ سچ کہہ چمن میں رہنے پاؤں جگا ہمارا آیشاں سچ کہہ

یہ ادھی ات ہے اور شیشہ سے ساتھ ہے تیرے خدا حافظ تیرا اے جان، جاتا ہے کہاں سچ کہہ

ہزاروں آجوا نسو کے تیرے ساتھ پھرتے ہیں تو کس گلزار کا ہے سرو اے رینا جواں سچ کہہ

نہک ڈالا ہے مجھ میں اے ہما، شورِ محبت نے کہیں کھلے ہیں تو نے اس نے کی استخوان سچ کہہ

یقین، راتوں کو کر شورِ بنڈیں سب کی کھوتا ہے

یہ کس بیدار سے سیکھا ہے فریادِ دفنان سچ کہہ

بت کرے سجدہ تیرے حسنِ خدا داد کو دیکھ سرو بندہ ہو، تیرے قامتِ آزاد کو دیکھ

ان گنہگاروں میں میں کفرے کے مارے جی نکلتا ہے میرا، دور سے جسدِ کو دیکھ

خمر میں تونے تو دیکھے ہیں بہت غم خانے آتو اے چرخِ ملک اک اس دن ناشاد کو دیکھ  
 حسن گل کا تو مستم ہی، ولیکن بلبیل عشق گر تجھ کو ہے منظور، تو صیاد کو دیکھ

عشق کے جو رستم میں تجھے گزشتک ہی قصیں

عیش پر دیز کو اور محبت فرہاد کو دیکھ

صہرت

منہ اپنا نہ دیکھا کر، ہو جائے گا دیوانہ آئینہ کو کہتے ہیں اے شوخ، پری خانہ  
 کیا دھوم بچائی ہے صحرائیں دیوانوں نے اس فصل مبارک میں آباد ہے ویرانہ  
 دل داغِ محبت بن، کچھ کام نہیں آتا ہر جوں و رقی باطل بے مہر یہ پروانہ  
 کچھ عمر نہیں باقی، ساتی تو شتاب آجا ڈرتا ہوں چھلک جاوے، لبر زری بیگانہ  
 منہ پھیر نہ نالہ سے آنسو سے نہ مورا نکھیں نشہ موج

اتنا بھی لقمیں مت ہو اپنوں سی بیگانہ

زاہد جو نہ ہم ہوتے، یہ دیر تھا دیرانہ ہے شور سے مستوں کے آباد یہ منجیانہ  
 منہ اپنے کے گلشن میں ٹبھنے نہ دیا کر خط یہ سبزہ ترے خط کا، ہی سبزہ بیگانہ  
 ہوں و ز پرہی میرا، راتوں کو ترے گھر پہ پھرتا ہی ٹرا، جیسے فانوس یہ پروانہ  
 مجنوں نے جو یہ دھوئیں و وری سے بچائی ہے نشہ، تو آ جاوے، یہ دشت یہ دیرانہ

روداد محبت کی مت پوچھ لقمیں مجھ سے

کچھ خوب نہیں سنا، افسوں ہے یہ انسانہ

# ردیف (ی)

زینجاریار کو پہلے فروں سے آشنا کرتی  
پھر اس سے سوطح پر اپنی حاجت کو روا کرتی  
مے جس کو پیمبرِ ساریب، اس کا خدا حافظ  
زینجاریار کرتی نہ یوسف کو تو کیا کرتی  
دل آزاری جلائے حسن ہے، یہ بات گسنتی  
عبارتِ خاطر مجنوں کو لیسے طوطیا کرتی  
موتے ہم فصل گل آنے سے آگے ہی خدا جانے  
کہ کیا کیا شوخیاں ہم ساتھ یہ ظالم ہوا کرتی

یقین، فرہاد کو دکھ سی چھڑانا اس کو لازم تھا  
زبان تیشہ، خسرو کو قیامت تک دعا کرتی

بہار آئی ہے، کیا کیا چاک جب پہن کرتے  
جو ہم بھی چھوٹ جاتے اب، تو کیا دیوانہ بن کرتے  
تصور اس دہان تنگ کا رخصت نہیں دیتا  
جو ہلک دم مار سکتے ہم، تو کچھ کر سہج کرتے  
نہیں جو بنچہ گل کچھ بھی ان ہاتھوں میں گہرائی  
وگر نہ، یہ گریباں، نذرِ خوبان چمن کرتے  
مسافر ہو کے آئے ہیں جہاں میں تپہ حشت ہے  
قیامت تھی اگر ہم اس خرابہ میں وطن کرتے

کوئی فرہاد جیسے بے زباں کو قتل کرتا ہے  
یقین، ہم واں اگر ہوتے، تو ایک دو بچن کرتے

چھٹے اس زندگی کی قید سے اور داد کو چھینے  
وصیت ہے، ہمارا خون بہا جلا داد کو چھینے  
نہ نکلا کام کچھ اس صبر سے، اب نہ کرتا ہوں  
میری فریاد ہی شاید میری فریاد کو چھینے  
ہیں اس غم کے ہاتھوں، زندگانی خوش نہیں آتی  
کوئی بیدادگر، یارب، ہماری داد کو چھینے

بہارا آئی ہے جبے، تب سے رگ میں تعیم نہیں سکتا دعا اس مشتِ خوں کی نشترِ قصاد کو چھینے

یقین، تقلید میں سرت پٹک تھریہ آہیں کر

یہ ممکن ہی نہیں، ہر چہ افرہاد کو چھینے

ارے صیاد اس بیداد پر بیداد کیا کیجے شکارِ ناتواں مجھ سے کے تیس آزاد کیا کیجے

اٹھانے کا نہیں میں ہاتھ جوں گل اس گریبا سے اگر بوبکی طرح جاوے گا جی برباد کیا کیجے

بہارا آئی ہے اور ہم گلستاں میں جانیں سکتے خدا کے واسطے تو ہی کہہ اے صیاد کیا کیجے

ٹلا گریبوں تو کیا ہوا خسرو نہیں ٹلتا بڑا پتھر ہے چھاتی پر ترے فرہاد کیا کیجے

جفا پر دلبروں کے صبر کرنا ہی مناسب ہے

یقین، دعویٰ وفا کا کر کے اے فرہاد کیا کیجے

اس سستی پوش سے آغوشِ رنگیں کیجے جی میں ہے اس مصرعِ موزوں کو تضمیں کیجے

دلبروں کو تاد رکھنا اس کا جب منظور نہیں دل کو ان کے واسطے کیوں مفت عملیں کیجے

عشق میں احت نہیں ملتی مگر جوں کو کہن جان شیریں دیکھے ت خواب شیریں کیجے

ایک دم میں بلبل سا پھوٹ جاتا ہے یہ دل کچھ تو لازم ہے کہ اس شیشہ کو سنگیں کیجے

یوں دیا، خوابوں کی خاطر خانماں اپنا ہبسا

ایسی آنکھوں پر یقین، کیونکر نہ تحسین کیجے

ہوا میں سرو کے، اتنا نہ کر شور و شر اے قمری نہ دے، برباد تو اپنی کفِ خاکستر اے قمری

نہ بھنے دیجو اس کو گرم رکھو آہ و نالہ سے یہ دل ہر مشتِ خاکستر کا تیری انگر اے قمری

کسودن اور پرپینچکی تھکوسر کی لفت  
مناسب نہیں نہ جایا کر چمن میں اکثر اے قمری

نہیں تو تعامتی اس شعلہ آواز کو اپنے  
کہیں حل جائینگے ناحق تیرے بال پر اے قمری

یقین کہ جو کہ شوخی خوب نہیں خواہیں کی خدمت میں

تو بیجا سرو کے چڑھ بیٹھتی ہے سر پر اے قمری

آئینہ عاشق کو خواہیں کے مقابل کیا کرے  
آپ حیراں ہے کسی کی حل مشکل کیا کرے

جس کو مرنے کی ہوس ہو اس کو جینا ہو بال  
زخم جب کاری نہ ہو پھر کے نہ بسمل کیا کرے

ناصح اس کی سوزن گان سے کھینچوں کیونکہ ہاتھ  
زخم کو مانگے نہ اپنے تو گھائل کیا کرے

بے قراری کب ٹھہرنے دے ہے جھکو زیر تیغ  
مارنا سیلاب کا مشکل ہے قاتل کیا کرے

شعر خاطر خواہ مجھ سے ہونیں سکتا یقین

جب ہو استعداد ناقص پیر کامل کیا کرے

بدلاترے تم کا کوئی تجھ سے کیا کرے  
اپنا ہی تو فریفتہ ہوئے خدا کرے

قاتل ہماری لاش کی تشہیر ضرور  
آئندہ تا کوئی نہ کسوے وفا کرے

جو کوئی عرض حال کرے تجھ جستی مرا  
اول بیان واقعہ کر بلا کرے

خلوت ہو اور شراب ہو معشوق سامنے  
زاہد تجھے قسم ہے جو تو ہو تو کیا کرے

ہوتا ہے خاک راہ وفا بیگماں یقین

ہے دل میں یہ کہ شرط محبت ادا کرے

جب ہو معشوق عاشق اور بانی کیا کرے  
بندگی کی جس نے خوکی وہ خدائی کیا کرے

مارے ہی جاتے ہیں آخر، گو کہن سے سر چپے  
 ایک پل بھی نہیں ٹھہرتا ہائے، یہ آنسو کی طرح  
 خسر و بے چارہ اور شیریں بچاری کیا کرے  
 اس دل بیابان کی کوئی تسلی کیا کرے  
 عشق ہی دشمن ہو مجھوں کا تو یہی کیا کرے

دھل کی گرمی سے مجھ کو ضعف آتا ہے لقمیں

دیکھئے مجھ ساتھ، خواباں کی جدائی کیا کرے

خدا مجھے تیرے داغوں سے لالہ زار کرے  
 قیامت آپ یہ اس قدم سے لاپکے ہم تو  
 یہ خارِ خشک تک ایک آگ سے بہا کرے  
 کہاں تک کوئی محشر کا انتظار کرے  
 نہ ننگ عار کرے، بلکہ افتخار کرے  
 ہمیشہ تیرے آپ تیغ کا ہوں لہیک  
 کہاں وہ سیل مری خاک پر گزار کرے

اجل نہ چھوڑے گی آخر لقمیں کو لازم ہے

کہ اپنے سر کو تیرے پاؤں پر شمار کرے

جیا و شرم سے کیوں کر کوئی خذر نہ کرے  
 جو یار غیر کے ساتھ اس طرف سے ہو گزارے  
 ادب سے تجھ پہ کوئی کب تک نظر نہ کرے  
 خدا کے واسطے، کوئی مجھے خبر نہ کرے  
 خدا کو کے تیں اتنا خوشگم نہ کرے  
 کسی چین میں خدا شجر بے ثمر نہ کرے  
 گلی سے یار کی کیوں کر کوئی خذر کرے  
 رقیب غالب دیوانہ دل غیور لقمیں

کہاں تک تیرے دل میں فغان اتر نہ کرے

لے ایک نسخہ میں مقطع اس طرح ہے۔  
 یقین ہے آگ سے پتھر کا پتھر نہیں چلتا

حق مجھے باطل آشنا نہ کرے  
دوستی بد بلا ہے اس میں خدا  
میں تبوں سے پھروں، خدا نہ کرے  
ہر وہ مقتول، کافر نعمت  
کسی دشمن کو مبتلا نہ کرے  
اپنے قاتل کو جو دعا نہ کرے  
پشت پاسے تری جدا نہ کرے  
رو مرے کو، خدا قیامت تک

ناصحوں، یہ بھی کچھ نصیحت ہے

کہ لقیں یار سے وفانہ کرے

مجھ کو تجھ بن دل سے کیا مطلب ہے، جو بے یار  
یار گر منظور ہے، دنیا و عقبیٰ سے گزر  
اختیار اس کا ہے، اس کے جی میں آوے سو کرے  
منزل مقصود ہے، دونوں جہانوں سے کرے  
اس طرح کے بے مروت دل سے کوئی کیا کرے  
کھیت ہو جاتی ہے جیسے مینہ بے سہ سے ہرے  
میرے رونے نے ترا خط کر دیا جلدی سے سبز

اس طرح رونے میں آنکھوں کا خدا حافظ لقیں

دیکھئے یہ خانماں اس رو میں دو بے یار ترے

ترا خورشید سا منہ دیکھ کر پھولوں کی جاں لرنے  
تسے خیمے ہی باد تیز کے چلنے سے ہلے ہیں  
ترے قد کی نزاکت دیکھ کر سر و گلستاں لرنے  
مرانا لہ اگر شوخی پہ آوے آسماں لرنے  
وگر نہ تیر لگتا ہی پریشاں گر کہاں لرنے  
نسیم گل سے ہمارے ناز کی کئی آسماں لرنے  
لیقیں، برجا ہی رونے میں کسو کی گزریاں لرنے  
وہ لمبل کیونکہ ہونے فارخس سے مختلط جس کا بیٹھ  
نہیں کہ بات سکتی شمع، پروانے کے ماتم میں



اٹھا سکتا نہیں تیشہ سر نیا پر خجالت سے  
صفا میں آئینہ کے کب ظل آتا ہر صورت سے  
ہوا ہو دام ہم کو آشتیاں آپس کی الفت سے  
کوئی نعمت گوارا نہ نہیں ہم کو مصیبت سے

نہ بیٹھا کو بہن کا نقش، کچھ اس رنج و محنت سے  
دل روشن کے تیس کب لگتی ہر ظلمت نظارہ کی  
رفیقانِ موافق ساتھ زنداں بھی گلستاں پر  
شراب تلخ کی لذت کو پوچھوے پرستوں سے

زمانہ میں جو عاشق ہیں تمنا میں ہیں جینے کی

ہمارا جی نکلتا ہی لقمیں مرنے کی حسرت سے

دیکھنا ہائے ہو سکتی ہر یہ جہاں کہاں سے  
کبھی تو طے بجایا کیجئے اے بلبلان ہم سے  
کہ خوب آبادی گزارا نہ خوشی ہر باغبان ہم سے  
ہمارے آہ و نالہ نے چھڑایا آشتیاں ہم سے

جو سرویں پہ رکھدیجے تو خوش ہو دیں تباہ ہم سے  
تمھارے بال پر سے باغ کی آتی ہے بو ہم کو  
کوئی ان بلبلان باغ سے یہ پوچھوے ہم کو  
جو چھپے دیکھتے گل کو تو کب صیاد وقف تھا

لقمیں، کچھ دم میں پھینے کا اندیشہ نہیں مجھ کو

پر اتنا ہی کہ شک آباد تھا یہ گلستاں ہم سے

کیا کیجے کہاں تک خاک گزریے ہم گریباں سے  
فلک جب چرخ میں آتا ہر تیرے دورِ امان سے  
گرفتار وفا کو کام اب کیا ہے گلستاں سے  
نہیں ہر مجھ کو چھوٹا کیا ن ان شہری الاں سے  
جو امیدِ وفا رکھتا ہی تو ان خوب رویاں سے

خوش آئی ہی مجھے یہ بات ایک مخجونِ عریاں سے  
اگر بر باد جاوے خاک میری کیا تعجب ہی  
نہ ڈالو مجھ پہ اے مرغانِ آزاد اپنے سایہ کو  
خبر میں ہائے لے سکتا نہیں اپنے بیاباں کی  
گل و بلبل کی صحبت کیا نہیں دیکھی لقمیں، تو نے

دیوانے کس طرح، ناصح، اٹھائیں ہاتھ طفلان سے  
 کہ ہر کشت جنوں سیرابان کے سنگ بار سے  
 یہ لکھا تھا ایک دن وہ پائے رنگیں میری جھاتی پر  
 سوا ب تک لوبے گل آتی ہر اس چاک گریباں سے  
 بتوں کی سب نے دیوانہ کیا ہی ہم کو محشر میں  
 گریباں کا ہم اپنے خون لیں گے ان کے داماں سے  
 یہ پوچھو تو کہ کیا یہ سرزمین محبوں کا مدفن ہی  
 چلی آتی ہیں شور انگیز باویں اس سیاہاں سے

ہمیں رخصت نہ ہو، گھنگر دیتوں کے پاؤں کو چوس  
 یقیں، یہ لوگ کیا ڈرتے نہیں دلہائے نالاں سے

تیس ہر جام مے بن، کچھ ہمارا خونہا ساقی  
 اس آپ نے زندگی سے اپنے ماروں کو جا ساقی  
 ٹمک ایک تو رحم کر، اب مر گئے کی تمنا میں  
 ہماری خاک پر ڈتے ہیں یہ ابرو ہوا ساقی  
 اسے زاہد نہیں بے دین ایماں اہل میخانہ  
 کہ ہر یہاں بادہ وحی و جام پییز خدا ساقی  
 بہارا آئی ہر پرافسون، یہ دن کیا بھلے کتے  
 جو ہوتا باغبان مخلص، ہمارا آشنا۔ ساقی

بڑھاپے میں یقیں کے جام مے سے دستگیری کر  
 شراب کہنہ ہی، اس رد پیری کی دوا ساقی

بہارا آئی، بجاؤ، بخلیوں، ساز عشرت کے  
 گیس حسرت کی وہ راتیں گئے وہ دن مصیبت کے  
 مڑے سے عشق کے، دوزخ بھی اس فرقہ چہ خبیث  
 خدا ہم کو کرے محسور امت میں محبت کے  
 تیری آنکھیں سمجھوں سے آشنا ہیں، در کسی نہیں  
 ہوئے جاتے ہیں دیوانے ہم اس ماؤں وحشت کے  
 بجا ہو، آسماں آگے ہمارے گرز میں ناپے  
 کہ ہیں باپاں، سایہ کی طرح، خوابوں کی قامت کے  
 بتاں اپنی جفا سیتی نہ گزریں ہم وفا سیتی  
 یقیں، ہم جان دل سے معتد ہیں اپنی ہمت کے

نہ سے برباد غارِ آشیاں کو عندلیباں کے  
 نہ دی فرصت کہ ان ہاتھوں سے کچھ کام اور بھی نکلے  
 صبا، یہ بھی ابھی خواہوں میں آخر میں گلستان کے  
 ہم آخر ہونگے دمنگیر اس جاگِ گریباں کے  
 جلتے ہیں ہم بہت ہاتھوں سے اس سروِ خراماں کے  
 گریباں بھاڑیے اس پر کہ کیا طالع ہیں اماں کے

جو مجنوں، آہوانِ دشت سے خوش تھا، تو وہ جانے

لغیس، ہم تو دیوانے ہیں ان ہی شہری غزلاں کے

شروعِ عمر سے ہم معتقد ہیں دشتِ ہاموں کے  
 جنھیں ہر ہوش، بیوشی کے طالب ہیں اگر دکھو  
 بجولے کی طرح جاو بکش ہیں قبرِ مجنوں کے  
 چھری ہرے پرستی نام سے خمِ فلاطوں کے  
 کھلے ہیں موئے لیلیٰ اب تک ماتم میں مجنوں کے  
 کہ ہم ایک عمر سے عادی ہیں خال لب کی افیوں کے

نہیں ہر باغ سے کچھ کام خبر شمشاد و سروان کو

دیوانے ہیں، لغیس، ہم قمریوں کی طبعِ موزوں کے

کہاں سکتے ہیں چڑھ منہ پر تباہِ ناز و مکس کے  
 بتوں کی بادشاہی کے سپہ سالارِ عاشق ہیں  
 کہ ہیں ہم صبر کے بے خرچ، مفلس ہیں دل و دس کے  
 بھائے کو بہن نے بستیوں میں نقشِ شیریں کے  
 گریباں گیر ہم ہوونگے اس دمانِ رنگیں کے  
 یہ شیشے قیمتی پھوڑے ہوئے ہیں خوابِ سنگیں کے  
 ہمارا سر نہیں لائقِ لغیس، اس نازِ بالیں کے  
 کیا تھا نکیہ، سنگِ آستانِ بابر، مجنوں نے

خبر کیا پوچھے مرغِ چمن سے آشیانے کی  
گئے پکڑے شروع گل میں اور پروازِ اول میں  
موا جاتا ہوں امت اتنا بھی کس کو نہ دھابوں کو  
یہ لذت جس نے اپنے پار سے پائی ہو سو جانے

ایسوں کو توقع کب ہی بھگشتن میں جانے کی  
نہ دی فرصت نہ مانہ نے ہمیں دھو میں مچانے کی  
ٹک ایک ڈھیلی تو کرے جان نہ بچ اس دیوانے کی  
نشہ میں گایاں کھانے کی اور پیلا پلانے کی

ہکتا ہی اس آجے تاجے مستی میں پاؤں اس کا  
ڈھلک جس طرح ہوتی ہی لہیں موتی کے دانے کی

کوئی میدان نہ جتیا عشق کا فرہاد کے آگے  
گئے دوڑے نہ آخر، حضرت یعقوب کنگا سے  
اکیلا کیونکہ لگتا بیستوں میں دل بخارے کا  
اگر دھڑکا ہو جنت میں تو بدتر ہی جہنم سے

کسو نے دم نہ مارا تیشہ فولاد کے آگے  
زمین ناپے پیر بھی حسن باور زاد کے آگے  
نہ ہوتا نقش شیریں کا، اگر فرہاد کے آگے  
ہیں گل خار سا لگتا ہی اس صناید کے آگے

یقین اس قدر کے آگے اس طرح سے سرور سوا

درخانِ بیابانی ہیں جوں شمشاد کے آگے

مجت میں مرزت کی حکایت کے سخن خالی  
ہے کب ہونگے اب تک بیستوں میں نقش شیریں کے  
گئی یہ کہہ کر آنے سے خزاں کے پستیر، طہیل

کہ جوں فانوسوں کی شمع بن ہی پیر من خالی  
دل اپنا کس سے کرتا ہو گا یاروں کو کہن خالی  
پھر ان آنکھوں سے کیونکر دیکھ سکے گا چمن خالی

لہ یہ مطلع یوں بھی آیا ہے:

دلِ برہ کیونکہ ہو میرا بغیر اک منہر خالی

تہی ہر شہر طفلان سے خزاں سے ہر بن خالی

موا آگے ہی جل کر شمع سے کیا خوب سمجھاتا نہ سکتا دیکھ پروانہ، سجن سے انجمن خالی  
خسارت ہر نقیس، سرکار کی اتنا سجن مت کر

نہ کر ان موتیوں سے جو صدف اپنا دہن خالی

گلی تیری اگر پوے تو بلبل گلستاں بھولے ترا نقش قدم دیکھے تو اپنا آیشاں بھولے  
جو کچھ دیکھا تجھے، اچھی طرح سے نقش خاطر، وہ ٹکھیلی سے ہنسا لاڈ سے ونا کہاں بھولے  
کیا ہر داغ ایسا یار نے مچھو کہ یہ قصہ سنے کر شمع اپنے سوزِ دل کی داستان بھولے  
تو ایسا آدمی ہیگا کہ تجھ کو گریہ دیکھے سمجھ کر صورت و معنی کو اپنا جسم و جان بھولے

تو لڑکا تھا سجن، جب سے نقیس کو تیری آنکھوں کی

سیاہی اور سپیدی دیکھ کر، پیر و جوان بھولے

شبِ ہجران کی وحشت کو، تو بے بیدار کیا جانے جو دن پڑتے ہیں اتوں کو مجھے تیری بلا جانے  
جدا ہم سے ہوا تھا ایک دن جو اپنے یاروں میں خبر پھر کچھ نہ پائی کیا ہوا واقعہ خدا جانے  
نہ رکھ لے ابر، تو سر پر ہمارے بار منت کا وہ بال اور ہیں جو آگ کو دل کی بھجا جانے  
نہ رکھ لے دل، تو امید وفا، ان ہونفاؤں خدا سے ہی وہ بیگانہ، جو بت کو آشنا جانے

جنوں نے اُس کے گل سے بلبلوں تک شوڑا لے

نقیس سا ہو کوئی، تب اس طرح دھو میں مچا جانے

ہمیں ہجرِ حین ہے موت، پر صیاد کیا جانے جو گزرے سر پہ مقتولوں کے، وہ جلا دیا جانے  
دیوانہ ہوں، میں جی دینے میں محضوں کے سلیقہ کا منے لے لے کے مرنے کی طرح، فرہاد کیا جانے

ہمیں کاٹنا قفس کا، شاخ گل سا جی میں چھبتا ہر  
اسیری کے مزے کو لبیل آزاد کیا جانے  
گلا تو پھٹ گیا نے کی طرح فریاد سے میرا  
قیامت ڈور ہر کس دن ملگی داڈ کیا جانے

درختوں سے نڈے تبتیہ اس قد کو لہیں ہرگز  
وہ اٹکھیلی سے چلنے کی طرح شمشاد کیا جانے

کوئی لطف ان تباہ کا کیونکہ بن دیوانہ بن جانے  
معانی نسخہ گل کے غزل خوان چمن جانے  
گر مپاں خاک کرنے سے تمارے جھکو کیا ناصح  
ہمارا ہاتھ جانے اور ہمارا پیسہ من جانے  
خطا ہر مفت مرکز یار کو دینا رقیوں کو  
ہماری ہم سے پوچھو، کوہکن کی کوہکن جانے  
فریاد تے میں مہکانے میں اس کے اور ت پوچھو  
چپکنے کی لبوں کے وجہ شیریں دہن جانے

طبعیت شعری اصلاح بن فاسد ہی رہتی ہے

وہ ہی سمجھے لہیں یہ بات جو جنس سخن جانے

عبث پالی ہر سینہ بیچ، آہ بے اثر ہم نے  
یہ کیوں اس خاک میں بویا تھا نخل بے لہر ہم نے  
محبت میں بن آہ و شک ناصح، کیونکہ جی سکے  
نہیں دیکھی ہر کوئی آگ بے دود و شر ہم نے  
نہ آیا کام، شام غم ہمارے کے اثر تیرا  
تری تفصیر کیا کی تھی ارے آہ سحر ہم نے  
نہ روئے ہجر میں پر وصل کے دن بے چلے آنسو  
اسی دن واسطے رکھے تھے گویا یہ گھر ہم نے

گلی میں لربا کے چل لہیں ڈھونڈیں دل اپنے کو

کہ مدت نہیں لی اس دیوانے کی خبر ہم نے

ضرر اس سے مقرر کیا کیا تھا باغباں تو نے  
جلانا حق دیا ان بلبلوں کا آشیان تو نے

اگر دعویٰ نہ کرتا عشق کا، بدنام کیوں ہوتا  
 زبانوں میں مجھے عالم کے ڈالا ہے زبان تو نے  
 بگلابی ہماری خاک سے اب اٹھ نہیں سکتا  
 ہمیں یوں کر دیا پامال، اے سرورِ رواں تو نے  
 مے آنسو بھی مارے ضعف کے، اب چل نہیں سکتے  
 کیا، اے عشق، مجھ کو، ہائے، ایسا ناتواں تو نے

یقین، بلبل کہاں ہوتا ہے پیدا اس سلیقہ کا

نہ کیا ہے منتخب خواہاں کے منہ کا گلستاں تو نے

یہ وہ آنسو ہیں جن سے زہرہ آتش ناک ہو جاوے  
 اگر پیوے کوئی ان کو تو جل کر خاک ہو جاوے  
 نہ جا گلشن میں، بلبل کو خجل مت کر، کہ ڈرتا ہوں  
 یہ دامن دیکھ کر گل کا گریباں چاک ہو جاوے  
 گنہگاروں کو ہے امید اس اشکِ ندیم سے  
 کہ دامن شاید اس آبِ وصال سے پاک ہو جاوے  
 عجب کیا ہے تیری خشکی کی شامت سے، جو تو زہا  
 نہاں تاک بھلاوے تو وہ مسواک ہو جاوے

دعاستوں کی کہتے ہیں یقین، تاثیر رکھتی ہے

الہی، سبزہ جتنا ہے جہاں میں، تاک ہو جاوے

نہیں کوئی کہ دشنام اس کی ہم تک یادِ علاوے  
 گیا ہوں، اب اس کو دیکھنے کب تک خدا لاوے  
 پڑیں پتھر، الہی اس محبت پر کہ وہ سبکدوش  
 مے اس طرح اور پڑے تیرے شیریں اچھالاوے  
 جو کچھ آباد ویرانہ کو ہم نے کر دیا کب تھا  
 کسی کو شبہ گر ہووے تو مجھوں کو دکھالاوے  
 دیارِ حسن تو خوش ہے، لیکن یہ پڑی مشکل  
 کہ لٹ جاتا ہے یہاں جو کارواں حسن و فالاوے

مناسب نہیں ہے شکوہ جو رکا ان خوب رویوں سے

یقین، کوئی بڑی باتوں کو اچھے منہ پہ کیا لاوے

مقابلہ میں وفا کے جو یہ جفا ہووے  
 کہو، کسی کا کوئی کیوں کہ آشنا ہووے  
 دیت کا نام نہ لیجئے، خدا کرے کہ کہیں  
 دیتے سے جی کے بھی قاتل کا حق ادا ہووے  
 اگر نجس رہیں یا دکر نہیں سکتا  
 کبھو برابر ہی ہمیں کہہ تیرا بھلا ہووے  
 یہ سب تو کرتے ہیں دعوتِ عشق، یار کہیں  
 جو آزمانے پہ آوے، بڑا مزا ہووے

یقین ہو اب مجھے قطرہ سے اشک کے معلوم

نہ اٹھ سکے جو کوئی آنکھ سے گرا ہووے

کیا دل ہے اگر جلوہ گر یا نہ ہووے  
 ہی طور سے کیا کام جو دیدار نہ ہووے  
 کچھ رنگ نہیں نغمہ و آہنگ میں اس کے  
 بلبل جو بہاؤں میں گرفتار نہ ہووے  
 دل جل جو گیا، خوب ہوا، سوختہ بہتر  
 وہ ضبن، کوئی جس کا خریدار نہ ہووے  
 شمشاد کو دیوے ہر قصا دار کے تجھ پہ  
 جو جامہ تیرے قد پہ سزا دار نہ ہووے

نہیں باغِ محبت میں یقین، اس کو کہیں جا

جس دل میں کہ داغوں سستی گلزار نہ ہووے

وفا کا، کیا قیامت ہی، جو کوئی بدلہ جفا دیوے  
 ترخم ان بتوں کو اپنے بندوں پر خدا دیوے  
 نہ تھی پرواز قسمت میں میرے صیاد، پراتنا  
 صبا سے کہیو میری خاک گلشن میں اڑا دیوے

۱۔ دولی نسخوں میں یہ مقطع اس طرح سے بھی ہے:

منظور یقین کس کو حقیقت کے معانی  
 طاؤس اور پرزیتِ دلدار نہ ہووے  
 تب بوجھے یقین، طبع کی صحت تیری، ناصح  
 ان آنکھوں کے تہیں دیکھ جو بیمار نہ ہووے



خفا ہو زندگی سے، مر گیا ہوں، تپہ ڈرتا ہوں  
مبت کا جو ماما ہی، عجب آداب ہیں اُس کے  
مبادا حشر مجھ کو خوابِ راحت سے جگا دیوے  
کہ جوں جوں یار دیوے گلیاں، عاشق دعا دیوے

یہ یقین زنجیر میں ہے، تب تو عالم میں نہیں تھلیں

جو ٹک چھوٹے یہ دیوانہ، ابھی دھو میں مچا دیوے

اگر دینی ہو دل کی داد، جتنا اس کا جی چاہے  
ملی ہیں یار کی گلیاں، ہمیں، جنوں سے یہ کہو  
تو کرنے دو اسے فریاد، جتنا اس کا جی چاہے  
نہیں ممکن کہ ہم کعبہ کو جائیں چھوڑت خانہ  
کرے ویرانہ کو آباد، جتنا اس کا جی چاہے  
وفا کا طوق ہے قمری صفت جزو بدن میرا  
کرے جو رستم صیاد، جتنا اس کا جی چاہے

یہ یقین، مجھ بن نہیں ہے قدر ان کوئی مصیبت کا

فلک مجھ پر کرے بباد، جتنا اس کا جی چاہے

یار کب دل کی جراحت پہ نظر کرتا ہے  
اب تو کرے نگہ لطف کہ ہو توشہ راہ  
کون اس کوچہ میں جز تیر گزر کرتا ہے  
اپنی حیرانی کو ہم عرض کریں کس منہ سے  
کہ کوئی دم میں یہ بیمار سفر کرتا ہے  
عمر فریاد میں برباد گئی، کچھ نہ ہوا  
کب وہ آئینہ پہ مغرور نظر کرتا ہے  
نالہ مشہور خطا ہے کہ اثر کرتا ہے

یار کی بات ہمیں کون سُناتا ہے یقین

کون، کب، گل کی، دیوانوں کو خبر کرتا ہے

چلا آنکھوں سے جب کشتی میں وہ محبوب جاتا ہے  
کبھی آنکھیں مہر آتی ہیں، کبھی جی ڈوب جاتا ہے

کہو کیوں گر نہ پھر ہو دے گا دل روشن زینجا  
 جہاں کے خوبرو مجھ سے چرامیں کیوں نہ آنکھیں  
 جہاں یوسف سا نور دیدہ یعقوب جاتا ہے  
 جو کوئی خورشید کو دیکھے سو وہ محبوب ہوتا ہے  
 مرا آنسو بھی قاصد کی طرح ایک دم نہیں رکتا  
 کسی بیابان کا گویا لے مکھوتب جاتا ہے  
 یقیں ہرگز کیا مت کر راتی تعریف لڑکوں کی  
 اسی باتوں سستی مضمون سا محبوب جاتا ہے

اگرچہ عشق میں آفت ہی اور بلا بھی ہے  
 اس اشک آہ سے سو دا بگڑنے جائے کہیں  
 نرا برا نہیں یہ شغل کچھ بھلا بھی ہے  
 یہ دل کچھ آب رسیدہ ہی کچھ جلا بھی ہے  
 یہ کون ٹھہرے سجن خاک میں ملانے کا  
 یہ آرزو ہے کہ اس بے وفا سے یہ پوچھوں  
 کہ سو کا دل کبھو پاؤں تلے ملا بھی ہے  
 کہ میرے بے مزہ رکھنے میں کچھ فرا بھی ہے

یہ یقیں کا شور جنوں سن کے یار نے پوچھا

کوئی قبیلہ رجنوں میں کیا رہا بھی ہے

نپٹ سونی ہیں گلیاں خاطر طفلان پریشاں ہے  
 نگاہ یار کی کوئی زباں اب تک نہیں سمجھا  
 کہو جنوں کو تجھ بن خانہ زنجیریں ہے  
 یہ وہ باتیں ہیں نازک جن سے آئینہ بھی حیران ہے  
 نکل بھاگل ہے کوئی صید کیا اس دم سے سچ کہہ  
 اگر زنجیر میرے پاؤں میں ڈال تو کیا ہوگا  
 کئی دن ہیں کہ میری زلف کی خاطر پریشاں ہے  
 بہار آنے دو میرا ہاتھ ہی اور یہ گریباں ہے

یہ یقیں دیکھ اس تجلی کی جلالی اور جمالی کو

گلی ان گلر جاں کی خون ناحق سے گلستاں ہے

کرتے ہیں، اپنے بال دکھا، مبتلا مجھے  
 دل نے میرے جودی ہی بڑھا، ٹوٹنے کی قدر  
 اس پہنچ سے بتاں کے نکالے خدا مجھے  
 کرتی ہے بال بال سے چینی دعا مجھے  
 جو روحنا میں یار بہت ہو گیا دلیر  
 ذہن کرتے تو کی پر اس نہ آئی وفا مجھے  
 میں خاک تو ہوا پہ میری آبرو رہی  
 زہی کرتے تھے دیدہ خوار جدا، دل جدا مجھے  
 میں گر رہا ہوں یار کے قدموں اور لقمیں  
 آئی ہو اس سایہ گل کی ہوا مجھے

عشق تیرے سے لگاوے نہ خدا عار مجھے  
 حسن اور عشق میں ایک طور سے نسبت ہی ضرور  
 نہ کرے دام رہائی میں گرفتار مجھے  
 چشم بیمار تجھے دی ہے، دل زار مجھے  
 یار آیا، پہ مجھے ہوش نہ تھا کیا کہنے  
 سنگِ طفلان کی میں امید پہ ہوں دیوانہ  
 تپہ دیتے ہیں تغافل سے یہ آزار مجھے  
 جب سے نظارہ کیا ترک، ہوا ہوں دل سرد  
 گرم رکھتا تھا لقمیں، شعلہ دیدار مجھے

ان پری زاد جوانوں نے کیا پیر مجھے  
 تیری تدبیر سے میں کیوں کہ مردوں گائے مرگ  
 کر دیا ضعف سے جوں سایہ، زمیں گیر مجھے  
 کی نہ ہو ہجر کے جب زہر نے تاثیر مجھے  
 جس کو منظور ہے مرنا، اُسے جیبا ہے وبال  
 ہے دم پاک میسا، دم شمشیر مجھے  
 خوار کرتا ہی، یہ نظارہ بے پیر مجھے  
 ہر بازسک گوہر عشق میں زنجیر مجھے  
 مچھو پیری میں کیا تازہ جوانوں کا مرید  
 کم نہیں جو ہر فولاد، جو اہر سے لقمیں

مفت کب آزاد کرتی ہو گرفتاری مجھے  
 کب ہو س ہے مجھ کو رسوائی کی، لیکن کیا کروں  
 جی ہی آخر لے کے چھوڑے گی یہ بیماری مجھے  
 کھینچ کر لاتی ہے اس کو چہ میں لاچار ہی مجھے  
 ان دنوں کرنی پڑی ہے دل کی غمخواری مجھے  
 عشق کے فن سے ابھی مجھ کو کہاں ہے اطلاع  
 کچھ نہیں آتا، بغیر از نالہ و زاری مجھے  
 کیا لگا لیتا ہے تو باں کو لہیں، کرتی ہے داغ  
 آئینہ کی سادہ لوحی ساتھ، پرکاری مجھے

دکھ تو دیتا ہے، کروں میں تجھ کو حیراں، تو سہی  
 اب میں دیتا نہیں تو مجھ کو اے ساتی، شراب  
 باغباں اب کے اجاڑے تو گلستاں تو سہی  
 میں کروں شیشہ کو تیرے سنگِ باراں تو سہی  
 اب تو ناصح کے تئیں سینے دو میرا چاکِ جیب  
 تار تار اس ضد سے کروں میں گریباں تو سہی  
 لوگ کب خاطر میں لاتے ہیں میرے دیرانہ کو  
 اشکِ خوں سے باغِ گردا لونِ بیاباں تو سہی  
 اپنے بندوں کو جلا کر خاک کرتے ہیں، لہیں  
 ان تہوں کی ضد سے ہو جاؤں مسلمان تو سہی

مجھ کے مزدوں کو کب ہر ایک پروچاں سمجھے  
 تم ہی قید کرنا اس طرح سے مرغِ ناداں کو  
 جو ابراہیم ہو، آتشکدہ کو گلستاں سمجھے  
 کہ جو مارے بھلائی کے، نفس کو آیشاں سمجھے  
 نہیں آنکھوں سے تیری حال میرا کچھ چھپا ہرگز  
 انھیں سروچمن کی طرح اپنے سر پہ پھلاؤں  
 جو کوئی بیمار ہو سو قدرِ جان نا تو اس سمجھے  
 جو اپنی قمریوں کی قدر وہ سرورِ واں سمجھے  
 بغیر از حضرت استاد مرزا جان جاں سمجھے  
 یقین کی گفتگو کے لطف کو بائد کب کوئی

یہ دل ملوک ہی خوبان کا کون اس کو چھپا رکھے  
بتاں کی گرم جوشی صبر کے خرمن کی آتش ہے  
بغل میں کیوں کہ ماں بادشاہی کو دبار رکھے  
خدا اس قوم کو بیگانگی کا آشتار رکھے  
تو قہ بازر کھنے کی نہیں اس کو خدا رکھے  
خدا ایسا ستم کب اپنے بندوں پر روا رکھے  
یقین جاتا رہا گر بلبلیوں کے ساتھ جانے دو  
کوئی اس بے مروت دل کو اپنے پاس کیا رکھے

شکون مشتاق دل میرا ہوا ہے سخت سودائی  
سکوت اہل سخن کا بھی نہیں خالی افادہ سے  
جہاں یہ دکھتا ہے سنگ و ہاں کرتا ہے مینائی  
قلم کی طرح خاموشی میں یہ رکھتا ہے گویائی  
تیری قامت کے آگے فرس ہو جاتی ہے رعنائی  
خدا شاید عجب بے بد مصاحب ہے تنہائی

یقین بیجا ہی میں کرتا ہوں بصیری کہ ڈٹا ہوں

محبت بیچ لگ جائے کہاں، ننگِ شکیبائی

ننگ ایک انصاف کر اتنی بھی کرتا ہے جفا کوئی  
نظر آتا نہیں ثابت، گریباں ایک غنچہ کا  
کرے گا بعد میرے کس توقع پر وفا کوئی  
چمن پر یہ ستم کرتا ہے، اے باو صبا، کوئی  
نہ ہو دیوانہ کیوں کر دیکھ تیرے دستِ پاک کوئی  
طلب کرتا ہے ایسے قاتلوں سے خونہا کوئی  
عجب سچ سے کیا ہے قتل مچھکو، اس کو مت لو کو  
گزر جاوے سے، گریہ میں دیکھے رضا اس کی

محبت میں یقین لیتا ہے نام مدعا، کوئی

گئے سب بھول شکونے دیکھ روئے یار، کیا کہئے  
 تبسم میں جو اس کا منہ کھلا دل بندھ گیا وہیں  
 زباں حیرت سے مبری ہو گئی بے کار، کیا کہئے  
 میرا دل لے گیا سنتے ہی سنتے یار، کیا کہئے  
 بہت دیتا ہی میرا دل مجھے آزار، کیا کہئے  
 جہنم، تو نے مجھ پر کر دیا، گلزار، کیا کہئے

یقین کے واقعہ کی سن خبر، وہ بدگساں بولا

یہ دیوانہ تو کچھ ایسا نہ تھا بیمار، کیا کہئے

زنجیریں بالوں کی پھیس جانے کو کیا کہئے  
 عاشق جو رہے جلتا، معشوق کے کام آوے  
 کیا کام کیا دل نے، دیوانہ کو کیا کہئے  
 کیا لطف ہو جل جانا، پروانے کو کیا کہئے  
 اپنے نے کیا یہ کچھ بیگانے کو کیا کہئے  
 فرہاد کے اس ناحق مر جانے کو کیا کہئے

صحرا میں، یقین، آہو کیا حور سے پھرتے ہیں

فردوس نہ کہئے تو ویرانے کو کیا کہئے

ت







977